TAMEER

تعمیر



تراوٕ یلہٕ مہجور باغ چھاوُن
ادٕ ونیہ آرٕ ول مسولہ کُن
راز دار ناز بردار کوتٕیٔ گوم
دل قرار توٚتہ مدنوار کوتٕیٔ گوم



دو عظیم فن کار—
مہجور اور پردیسی

حضرت مہجور کشمیر کے
شاعروں، ادیبوں اور
دانشوروں کے ساتھ



پیغام

سیاسی آزادی کے حصول کے بعد اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی تہذیبی روایات اور ادبی اقدار کے احیاء کے لئے سرگرم عمل ہوں ہمیں ماضی کے ورثے کو کھنگال کر اُسے دُنیا کے سامنے پیش کرنا ہوگا۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ کشمیری عوام جہاں اپنی عظیم الشان کلچرل روایات کو عزیز رکھتے ہیں وہاں ساتھ ہی ساتھ نئی زندگی کے تقاضوں سے بھی غافل نہیں ہیں!

مہجور کی شاعری ہماری عظیم ادبی میراث ہے۔ اس لئے مہجور کی یاد تازہ کرنا ایک اہم ادبی فریضہ ہے مجھے خوشی ہے کہ 'تعمیر' مہجور کی یاد میں ایک خاص نمبر شایع کر رہا ہے۔ ریاست کے فن کاروں کو ریاست سے باہر متعارف کرانا بہت ضروری ہے، اس سلسلے میں 'تعمیر' کا مہجور نمبر ایک مبارک قدم ہے!

(دستخط) جی، ایم بخشی

تعمیر سرینگر

مہجور نمبر

اپریل و مئی ۱۹۵۷ء

جلد ۲ ○ شمارہ ۴، ۵

ایڈیٹر

شمیم احمد شمیم

جوائنٹ ایڈیٹر

محمد یوسف ٹینگ

قیمت سالانہ

۶ روپے

فی پرچہ

۵۰ نئے پیسے

پرنٹر پبلشر عبدالغنی وڈھیرا نے مکتبہ لالہ رخ پبلکیشنز کی طرف سے شائع کیا۔

زاویئے

۱۸۵۷ء کے انقلاب کو غدر کا نام دے کر سامراجی مورخین نے ہمیں یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ یہ ایک فوجی شورش تھی، جو چند سر پھرے فوجیوں کی فوجی قوانین کی خلاف ورزی سے شروع ہوئی، بہت عرصہ تک ہم اس غلط فہمی کا شکار رہے اور جنگ آزادی کے اس پہلے سنگ میل کو غدر کے نام سے یاد کرتے رہے، اب جبکہ زبانوں پر سے پہرے اٹھا دئیے گئے ہیں، تو فکر نے بھی انگڑائی لی ہے۔ اور ہم سن ستاون کے اس عظیم انقلاب کو اپنے تاریخی پس منظر میں دیکھ سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سن ستاون کے بہت پہلے ہی انگریزی تسلط کے خلاف عام بے چینی پھیلی ہوئی تھی، جس کا اثر خاص طور پر تین طبقوں میں محسوس ہو رہا تھا، ایک تو امراء و والیان ریاست، جن کا اقتدار ختم ہو رہا تھا، اور الحاق کی پالیسی سے مستقبل بالکل ہی تاریک نظر آنے لگا تھا، دوسرے علماء اور پیشوایان مذہب جنہیں عیسائی مشینریوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں اور ان کے ساتھ حکومت برطانیہ کی علانیہ وابستگی ایک مذہبی خطرہ نظر آ رہی تھی، تیسرے ہندوستانی سپاہی جن کے ساتھ انگریز سپاہیوں کے مقابلے میں نہایت ذلیل سلوک کیا جاتا تھا، اور جائز مطالبات پیش کرنے پر بھی ظالمانہ سزائیں دی جاتی تھیں۔ اس طرح غیر ملکی اقتدار کیخلاف نفرت کا یہ جذبہ نہ صرف فوج میں پایا جاتا تھا۔ بلکہ مذہبی علماء اور والیان ریاست کے ہاں بھی یہ جذبہ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود تھا۔ ۹ مئی کو میرٹھ کے فوجی افسروں نے جب ۵۰ فوجی سپاہیوں کو چربی والے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کرنے پر سزا دی، تو بغاوت کا یہ لاوا پھوٹ پڑا، اور ۱۰ مئی کو انگریز کے خلاف باقاعدہ بغاوت کا اعلان کر دیا گیا بغاوت کا اعلان ہوتے ہی بقول مولوی ذکاء اللہ سپاہیوں کے علاوہ اس میں بازاروں کے اور ہمسایہ کے دیہات کے آدمی بڑی خوشی سے شریک ہوئے، ہر طرف سے ہزاروں آدمی ٹوٹ پڑے ہاور اس طرح میرٹھ کی برطانوی فوج کو شکست ہوئی، اور ہماری پہلی جنگ آزادی کے سپاہی مظفر و منصور آگے بڑھے۔ جنگ کے تفصیلی واقعات کے تذکرے کا یہ موقع نہیں، لیکن یہ کہنا ضروری ہے کہ بغاوت کی جنگ کے شعلے آناً فاناً دہلی، کان پور بریلی، جھانسی، گورکھپور، الہ آباد، بنارس، اعظم گڑھ، نگینہ اور نجیب آباد تک پھیل گئے۔ اور انگریزوں کو اپنی پوری قوت صرف کرکے اس آگ کو بجھانا پڑا۔ بظاہر آزادی کی یہ جنگ ناکام ہو کر رہ گئی۔ لیکن مورخ یہیں سے اس نئے انقلاب کی بنیاد تلاش کرتا ہے، جس نے تقریباً سو سال بعد انگریز کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ یہیں سے بقول احتشام حسین نئے معاشی تعلقات، نئے ادبی رجحانات، نئے طریقہ تعلیم، نئے طبقاتی روابط اور نئی اصلاحی تحریکات کے نئے طوفان اٹھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں بغرضیکہ ہندوستان کی معاشی، سیاسی، اور تمدنی زندگی میں جتنی جدید تحریکات رونما ہوئیں، وہ ایک منطقی اور لازمی نتیجہ تھیں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی اسطرح غدر واقعات کے لحاظ سے اتنا عظیم اور ہمہ گیر انقلاب نہیں ہے، جتنا نتائج اور اثرات کے لحاظ سے!

آج سو سال بعد ہم جب اپنی پہلی جنگ آزادی کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔ ہمیں نئی نسلوں کے ذہن سے ۱۸۵۷ء کے متعلق شعوری طور پیدا کردہ ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوششیں کرنا ہوگی، جو بیرونی مورخین نے صرف اس لئے پیدا کر رکھی تھیں کہ ہم بھی اس انقلاب کو اسی زاویہ نگاہ سے دیکھیں، جس سے برطانوی سامراج اسے دیکھتا رہا — تاریخ کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا، اور آج سو سال بعد ایک نئے تاریخی شعور کی ضرورت محسوس

ہو رہی ہے۔ جو تاریخ کا مطالعہ تعصبات سے بالاتر ہو کر کر سکے۔

•

ریاست میں نئے آئین کے تحت عمل میں لائے جانے والے انتخابات قریب قریب ختم ہو چکے ہیں۔ اب صرف ضلع ڈوڈہ اور لداخ کی سات نشستوں کا انتخاب باقی ہے۔ ان کے لئے بھی انتخابات کی تاریخوں کا اعلان کر دیا گیا ہے انتخابات کا کام جس اطمینان بخش اور حوصلہ افزا ماحول میں ہوا ہے۔ اُس سے یہ اندازہ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ ریاست میں جمہوری نظام کی تشکیل کا یہ تجربہ غیر معمولی طور کامیاب رہا۔ ریاست کی تاریخ میں یہ پہلا انتخاب ہے۔ جس میں یہاں کے عوام نے اتنی دلچسپی اور جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ بعض جگہوں پر جہاں پرجا سوشلسٹ، پرجا پریشد اور آزاد اُمیدواروں نے نیشنل کانفرنسی اُمیدواروں کا مقابلہ کیا، مخالف اُمیدواروں کو وہ تمام سہولیات میسر تھیں جو نئے آئین میں ہر اُمیدوار کو عطا ہوئی ہیں۔ جس میں اپنی تمام ہلڑبازی اور ہنگامہ آرائی کے بعد بھی پرجا پریشد پانچ سے زیادہ نشستیں نہ جیت سکی، پرجا سوشلسٹ پارٹی اپنی ضمانتیں ضبط کرانے میں باقی سب پارٹیوں سے جیت گئی، کشمیر میں صرف ایک آزاد اُمیدوار جیت گیا، اور باقی تمام پر نیشنل کانفرنسی اُمیدواروں کا قبضہ ہو گیا، نیشنل کانفرنس کی یہ عظیم الشان فتح ایک منطقی نتیجہ تھی، اس ترقی، تعمیر اور خوش حالی کی، جو نیشنل کانفرنس کی حکومت میں ریاست کو نصیب ہوئی ہے۔ اور جس کا اعتراف برطانیہ کے دو عظیم لیڈروں نے بھی کیا ہے، مسٹر ایٹلے کے بعد مسٹر بیون نے کشمیر کی ترقی اور خوش حالی کے متعلق جن تاثرات کا اظہار کیا ہے، وہ اس بات کی دلیل ہے کہ ریاستی تعمیر و ترقی کا ڈھانچہ ٹھوس بنیادوں پر قائم ہوا ہے۔ اور مخالفین کو زبانی جمع و خرچ کی بجائے نیشنل کانفرنس کا مقابلہ کسی ایسے تعمیری پروگرام سے ہی کرنا ہوگا، جو ملک کی اقتصادی آزادی کا ضامن ہو، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ملک میں کسی ایسی جماعت کا وجود نہیں ہے جو اس قسم کا کوئی ٹھوس پروگرام رکھتی ہو۔ پرجا پریشد کو حالیہ انتخابات کے نتائج سے اس بات کا احساس ہو جانا چاہیئے کہ کھوکھلے جذباتی نعرے بہت دیر تک عوام کو مغالطے میں نہیں رکھ سکتے، مذہبی نعروں کے لئے پاکستان میں جگہ ہو تو ہو، ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں۔ پرجا سوشلسٹ پارٹی انتخابات میں جس بُری طرح ہاری ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس جماعت کا ریاست میں عملاً کوئی وجود نہیں، وہ چند افراد کی ایک فرضی تنظیم ہے، جس کی سرگرمیاں اخباری بیانات تک ہی محدود ہیں۔ محاذ رائے شماری اور پولیٹیکل کانفرنس کا وجود اور عدم وجود اس لحاظ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ ان دو جماعتوں کا ملکی سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں ہے، نئے آئین کے نفاذ کے بعد قانوناً ان کا وجود ختم ہو چکا ہے۔ اور یہ جماعتیں عملاً ابھی تک صرف اس قدر کام کر چکی ہیں کہ ریڈیو پاکستان کے بے بنیاد نشریوں کیلئے غذا مہیا کرتی رہیں۔ غرضیکہ ملک بھر میں نیشنل کانفرنس ہی ایک ایسی تنظیم ہے، جو صحیح معنوں میں اپنے سامنے ایک ترقی پسند، تعمیری پروگرام رکھتی ہے، اور جس نے گذشتہ دس سال سے اس پر عمل پیرا ہو کر اپنے وجود کو منوا لیا ہے۔

•

کشمیری زبان کا تمام تر سرمایہ اس کا شعری ادب ہے۔ نثر اس میں تقریباً ناپید ہے اور زبان ابھی تک رسم الخط کی اُلجھنوں سے آزاد نہیں ہوئی ہے۔ ان حالات میں اس زبان کے کسی شاعر کے فن اور اسکی شخصیت پر نقد و نظر کا کام کتنا مشکل ہو سکتا ہے۔ اس کا اندازہ مہجور کی یاد میں 'تعمیر' کے اس خاص نمبر کی تیاری کے دوران میں مجھے ہوا ہے کہ فکر و فن کے وہ معیار جو تنقید کی بنیاد ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں ناپید ہیں۔ اسلئے مہجور کی شخصیت اور فن کے بارے میں جو مضامین اس خاص نمبر کی زینت ہیں۔ ان کا مطالعہ اس حقیقت کی روشنی میں کرنا ہوگا کہ کشمیری زبان میں تنقید کی کوئی روایت نہیں ہے۔ اور ان مضامین میں نقد کا جو معیار ہے وہ یا تو تاثراتی ہے یا اردو اور انگریزی سے مستعار۔ یہ صحیح ہے کہ تنقید کی بیشتر قدریں آفاقی ہوتی ہیں، لیکن ہر ادب کا چونکہ اپنا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے، اس لئے تنقید کی ان آفاقی قدروں کا بھی اس مزاج کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ اور یہ ہم آہنگی روایات اور تجربات کے ایک تسلسل سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ 'تعمیر' کا یہ خاص نمبر اپریل اور مئی کا مشترکہ شمارہ ہے، اور ہم نے زیادہ سے زیادہ لکھنے والوں سے تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، ہمیں اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے اس کا فیصلہ آپ کیجئے۔

تعمیر کا یہ خاص نمبر ایک تجربہ ہے، اور اگر یہ تجربہ کامیاب رہا، تو یہ نمبر اس سے بہتر نمبروں کا ابتدائیہ ہوگا۔ 'تعمیر' کے مہجور نمبر کے سلسلے میں ہمیں قارئین کی رائے کا انتظار رہے گا۔

مہجور کاشمیری

گُلشن وطن چھُو سونُوی

بلبل وِنان چھ پوشن   گُلشن وطن چھُ سونُوئ   اسہ وِن زمین چھ پانپر   گرٛھ وُچھ ژہ کونگہ اوڈر

سونُوی وطن چھُ گُلشن   تتہِ دِل بلی ژلی شر

گُلشن وطن چھُ سونُوئ   گُلشن وطن چھُ سونُوئ

اندِ اندِ سفید سنگر   دیوارِ سنگِ مرمر   شوکھ ناگ توسہ میدان   تتہِ وُچھ ہرِ پانہ بھگوان

منز باگ سبز گوہر   بگتن چھ جلوہ ہاوان

گُلشن وطن چھُ سونُوئ   گُلشن وطن چھُ سونُوئ

ناگن کولن نہ آرن   جوین نہ آب شارن   وُچھ لولرک ژہ میدان   سرسبز کوہ بیابان

دِتا سوز نو بہارن   مومتِ چھ زندہ سپدان

گُلشن وطن چھُ سونُوئ   گُلشن وطن چھُ سونُوئ

وِرقم نہ ٹیکہ بٹہ نے   سُولہِ آئے چائے رٹِہ نے   بُلبُل کران گُلن گتھ   بُمبُر یمبرزلن پتھ

لگِ ٹوُرِ جامہ ژٹہ نے   کاشر چھ مست مس چیتھ

گُلشن وطن چھُ سونُوئ   گُلشن وطن چھُ سونُوئ

کرِ بیر ڈال برتھ یرٛھ   دریائے گُل وُچھان گرٛھ   مہجورہ دیس سونُوئ   باغاہ چھُ نُندہ بونُوئ

پم پوشس دِل رٹچھان گرٛھ   اَتھ لول گرِٛھ برونُوئ

گُلشن وطن چھُ سونُوئ   گُلشن وطن چھُ سونُوئ

مہجور کا سیاسی شعور

(جناب بخشی غلام محمد وزیر اعظم جموں و کشمیر)

قوموں کے کردار کی تشکیل اور ان کی ذہنی نشو و نما میں شاعروں کا جو حصہ رہا ہے اس کی اہمیت کو روز بروز محسوس کیا جا رہا ہے۔ شاعر کا انداز ایک خطیب یا مصلح کا انداز نہیں ہوتا۔ وہ بالواسطہ طور ہمارے شعور کو متاثر اور متحرک کرتا رہتا ہے۔ تاثر کا یہ عمل پیچیدہ ہوتا ہے۔ شاعر اور قاری کے ذہنوں کے درمیان جب تک ہم آہنگی پیدا نہ ہو۔ تب تک اس کا کلام ہمارے احساس میں شدت پیدا نہیں کر سکتا۔ اور احساس کی اس شدت کے بغیر شاعر کے کلام سے محظوظ اور مستفید ہونا ممکن نہیں۔

کشمیر کی ادبی تاریخ میں مہجور کا جو مقام ہے اور اس نے جس طرح ہماری قومی تحریک کو متاثر کیا ہے۔ اُس کے پیش نظر مہجور کی یاد کو تازہ رکھنا اور اس کے کلام کے محاسن کو اجاگر کرنا ایک اہم قومی فریضہ ہے۔ آج جب ہم آزادی، ترقی اور تعمیر کی اس منزل پر کھڑے ہیں جہاں سے ہماری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، مناسب ہے کہ قومی تحریک کی جدوجہد میں مہجور کے عظیم رول کا جائزہ لیا جائے۔

شخصی مطلق العنانی کے ظلم و تشدد کے خلاف جدوجہد میں مہجور کی آواز نے یہ ثابت کر دیا کہ آزادی کی جنگ میں طاؤس و رباب بھی تیغ و تلوار سے کم نہیں۔ مہجور نے اپنی کشمیری شاعری کا آغاز ایک روایتی انداز میں کیا اس کے ہاں غزل کی وہی مخصوص روایتیں، علامتیں اور مضمون ملتے ہیں جو اس سے پہلے کشمیری شاعری کا خاصہ رہی تھیں۔ مہجور کی ابتدائی غزلوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مہجور پر فارسیت کا کس قدر غلبہ تھا۔ لیکن مہجور نے رفتہ رفتہ اپنے ہاں کی قومی تحریک سے متاثر ہونا شروع کر دیا۔ اور اس طرح نئے اثرات کو قبول کر کے ان کے ذہن نے ایک بڑی اہم کروٹ لی۔ ان کے کلام سے فارسیت کا ملمع اُٹھنے لگا۔ اُن کی زبان زیادہ صاف اور شیریں ہوتی گئی۔ انہوں نے غزل کے مخصوص مضامین کی حد سے باہر قدم رکھ کر ان قوتوں کی آواز میں اپنی آواز ملا دی۔ جو اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہی تھیں۔ ایک وقت وہ آ گیا جب مہجور نے اشارات و کنایات کی بجائے واضح الفاظ میں شخصی مطلق العنانی کے خلاف بغاوت کر کے مجاہدین آزادی کا لہو گرمایا۔ برادران وطن کو یک جہتی، برابری اور برادری کا سبق دیا۔ اپنی شاندار ملکی اور قومی روایات کو ہمارے سامنے پیش کر کے آزادی کی خطرناک منزلوں پر ہماری ذہنی قیادت کی۔ اور یہ وہ کام تھا جو بڑے بڑے سیاسی لیڈر بھی اپنی دھواں دھار تقریروں سے نہ کر پائے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہر سیاسی جلسے میں مہجور کی نظمیں اس جوش و عزم اور ولولے کے ساتھ گائی جاتی تھیں کہ سامعین پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس طرح جب کبھی تحریک آزادی پر کوئی نازک مقام آیا، مہجور کی آواز نے مستقبل کے سہانے سپنے دِکھلا دِکھلا کر ہمارے حوصلوں کو بلند رکھا، انہوں نے ہمارے قومی جذبات کی عکاسی کی اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو کافی حد تک محض اس غرض کیلئے وقف کر دیا کہ ماضی اور نئی اُبھرتی ہوئی زندگی کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہو جائے، وہ جہاں ماضی کی روایات کا ترانہ گاتے رہے، وہاں نئے کشمیر کا راگ بھی الاپتے رہے۔ انہوں نے ہماری قوم کے رباب حیات کو اپنے غور و فکر کی مضراب سے چھیڑ کر اس کی تاروں سے ایک نئی لرزش، ایک نئی تھرتھراہٹ اور ایک نیا ساز پیدا کر لیا۔ ایک غلام قوم کو نئے سیاسی شعور اور نئی زندگی سے مانوس کرانے کے لئے سیاسی فلسفے اور تقریروں کے علاوہ کچھ ادبی اور تمدنی قدروں کی ضرورت ہوتی ہے کشمیر کی تحریک آزادی میں یہ فریضہ



Oleg Strizhenov (in the role of the Russian traveller, Afanasi Nikitin) and Balraj Sahni (as the Indian singer Saka Rama) in the Indo-Soviet joint production, "Pardesi".

Stills from the film "Pardesi"





The story of the first Indo-Soviet film "Pardesi" is based on the remarkable journey of a Russian merchant Afanasi Nikitin to India and on his notable exploits there in the 15th century.

ہجور نے انجام دیا۔ یہ صحیح ہے کہ ہجور کے علاوہ ان کے ہمعصروں نے بھی تحریک آزادی میں اپنا حصہ ادا کیا۔ مگر ہجور وہ واحد شاعر ہیں جو باقاعدہ ملک کی سب سے بڑی تنظیم سے وابستہ ہو کر جدوجہد آزادی میں شریک رہے۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ انفرادی کاوشیں اجتماعی کوششوں کے ساتھ مل کر ہی خود ایک قوت بن جاتی ہیں۔ قطرے کی حقیقت مسلّم، لیکن سمندر میں شامل ہونے سے اس کی انفرادیت ختم نہیں ہوتی۔ اس کے وجود کو دوام حاصل ہو جاتا ہے۔ ہجور کو اس حقیقت کا شدید احساس تھا، اس لئے تحریک آزادی سے شعوری طور ان کی وابستگی ان کے بلند شعور اور بالغ نظری کی دلیل ہے!

ہجور کا سب سے بڑا کارنامہ اس نظریے کی تبلیغ اور اشاعت ہے جو ہماری قومی تحریک کا طرّۂ امتیاز ہے اور یہ نظریہ ہے، مذہبی برابری، برادری اور رواداری کا۔ ہجور نے جن حالات میں پرورش پائی اور انہوں نے اپنی زندگی کا آغاز جس پریشان کُن ماحول میں کیا۔ اس کے پیش نظر ان سے یہ بھی توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ مذہبی تنگ نظری کا شکار ہو کر ایک غلط راہ پر پڑ جاتے، مگر ہجور کو انسانیت کی بلند اور عظیم قدروں کا احساس بچپن سے ہی رہا تھا، وہ عمر بھر مذہبی تعصب اور تنگ نظری سے لڑتے رہے اور اپنی تمام شاعری میں وہ اپنے ہم وطنوں سے یک جہتی اور رواداری کی تلقین کرتے رہے۔ شاعر کی آواز اپنا سحر کر گئی۔ ہمارے ذہنوں میں مذہبی رواداری کا وہ شدید احساس سرایت کر گیا کہ ۱۹۴۷ء کی خون آشامی بھی ہمیں اپنی منزل سے منحرف نہ کر سکی ہمارے اس قومی کردار کی کئی سیاسی توجیہیں کی گئی ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس کردار کی تشکیل میں ہمارے قومی شاعروں کا بھی حصہ رہا ہے۔ اور ان میں ہجور کا نام خاص طور پر اس لئے قابل ذکر ہے کہ وہ خود قومی تحریک کے ایک جانباز سپاہی تھے۔

ہجور کے سیاسی رجحانات اور نظریات کا مطالعہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ وہ خود مطلق العنان نظام میں ایک پٹواری کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے، وہ اس نظام کی خامیوں، کمزوریوں اور کوتاہیوں پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے، اسی لئے ان کے جذبۂ بغاوت میں شدّت کے ساتھ ایک نئے نظام کا تعمیری تصوّر بھی ملتا ہے۔ اور نظام کہنہ کی تخریب کے ساتھ ایک نئے تعمیری نظام کا تصوّر ہمیں وہی شاعر دے سکتا ہے۔ جو اپنے ذہن میں انقلاب کا صحیح تصوّر رکھتا ہو۔ ہجور کے ہاں یہ تصوّر قدم قدم پر ملے گا۔

ہجور کی بے پناہ مقبولیت کی مختلف توجیہیں کی گئی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ سبھی اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ لیکن ان کے قبولِ عام کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ماحول کی ضروریات اور تقاضوں کو سمجھ کر ان رجحانات کا ساتھ دیا۔ جو ملک کو آزادی، ترقی اور تعمیر کی طرف لے جا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے قومی مزاج کو سمجھ کر اپنی شاعری کو روایات کی نذر کر دینے کی بجائے ایک نئے انقلابی آہنگ کو اپنایا۔ جو نیا ہوتے ہوئے بھی مانوس نہ تھا، اس لئے کہ اس کی جڑیں ماضی تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اور اس میں ماضی سے علیحدگی نہیں بلکہ ہم آہنگی کا تصوّر ملتا تھا۔ ہجور اس لحاظ سے کشمیری شعر و ادب کی نشاۃ الثانیہ کے علمبردار ہیں کہ ان کے ہاں خالص تغزل کے علاوہ نئے فکری رجحانات اور عصری میلانات کا امتزاج ملتا ہے۔ ان کی شاعری جہاں حال کی غمّاز ہے وہاں مستقبل کی بھی نقیب ہے اور عظیم شاعری کا یہی خاصہ ہوتا ہے۔

ہجور اس لحاظ سے بڑے خوش نصیب تھے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں ہی اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھ لی۔ ملک آزاد ہو گیا، شخصی مطلق العنانی کا طلسم ٹوٹ کر اقتدارِ اعلیٰ عوام کے ہاتھوں میں آ گیا۔ اور ملک تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ اب اس منزل پر ہمیں ایک بار پھر ہجور کی شیریں نوائی کی ضرورت تھی کہ ہم ملک کی نئی تعمیر ایک نئے حوصلے اور عزم کے ساتھ کریں۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا، ہجور ہم سے چھن گئے، اور ہم بہت سے ان نغموں اور گیتوں سے محروم ہو گئے، جو ہجور اپنے ساتھ لے گئے وہ ابھی ہمیں کیا کچھ دینے والے تھے، اس کا افسوس کرنا بے سود ہے وہ ہمیں کیا دے گئے، اس کا احساس کرنا ضروری ہے، ہجور کی عظمت کو ابدی بنانے کی صرف ایک ہی صورت ہے، اور وہ ہے اس جذبے اور احساس کی نشوونما، جو اس کی شاعری کا جزوِ غالب ہے، یہ جزو ہے ہجور کی بے پناہ حبّ الوطنی اور مذہبی رواداری ہجور نے جہاں کشمیر کے کہساروں اور لالہ زاروں کے گیت گائے ہیں، وہاں اس نے قومی روایات کو بھی اُبھارا ہے، جو ہمارے کلچر، تمدن اور تہذیب کا خاصہ رہی ہیں۔ ہجور کے تصوّرات ہماری اس رنگارنگ تہذیب کے آئینہ دار ہیں۔ جو یہاں کے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے اشتراک سے ظہور میں آئی۔ ان کے ہاں اس تہذیب کی کثرت کا تماشا بھی ہے اور وحدت کا نظارا بھی!

پی، این، پُشپ

مہجورؔ ـــــ میری نظر میں

(مہجورؔ آج ہماری نظروں سے اوجھل ہے مگر اُس کی شاعرانہ شخصیت ہمارے قومی تصور میں ہمیشہ جھلملاتی رہیگی اور کشمیری ادب کی تاریخ میں اُسکا نام زندۂ جاوید رہیگا) شاعر کی پانچویں برسی کے موقع پر میری حسرتیں مچل اٹھی ہیں کہ "نیا کشمیر" کے اس نقیب شاعر کو ہم اپنے درمیان نہیں پاتے ۔

مہجورؔ کی یاد آتے ہی میرا تصور بیس سال پیچھے کی طرف لوٹ جاتا ہے شِوراتری کے دن تھے۔ گاؤں کی فضائیں شہنائی کے ترنم سے گونج رہی تھیں۔ بھانڈوں کی ٹولیاں سویرے سے ہی گھر گھر گھوم رہی تھیں۔ ایک ٹولی ہمارے صحن میں بھی آگئی۔ ڈھول پر چوٹ پڑی، شہنائی بج اُٹھی۔ سُریلی دُھن ہواؤں میں لہرانے لگی۔ رقاص کے پیر تھرک اُٹھے اور سُر اونچا ہوتا گیا۔

ویسئے سُومیون دلبر   شیرین کلام ییہ کر
یس کُن وُچھتھ ژلان شر   سُوہی گل اندام ییہ کر

(سکھی، میراوہ دلبر شیرین کلام کب آئے گا؟ جسے دیکھکر دل کے ارمان نکلتے ہیں وُہ گل اندام کب آئے گا؟)

گیت کے بول میں فارسیت کی بھرمار مجھے پسند نہیں آئی۔ کالج میں انگریزی 'رومانٹک' شاعری سے لُطف اندوز ہوکر میں کشمیری شاعری کو بھی اُسی زاویے سے دیکھنے لگا تھا۔ غزل کے اس مطلع پر غور کر ہی رہا تھا کہ مقطع سنائی دیا۔

مہجورؔ چان آلو بُوز سنگرو نہ بالو
چانیو فراقہ نالو گژھہ نا سُہ رام، ییہ کر

(مہجورؔ تیری پکار پہاڑوں اور کوہساروں نے سُن لی، نالہائے فراق سے وُہ (محبوب) رام نہیں ہو جائے گا؟ وُہ آئیگا کب؟)

مہجورؔ کا نام پہلے بھی سُن چکا تھا۔ اُس کی 'پوشہ متہ جانانو' اور 'سوزِ دل میون بوزِ دن ہارُے'، اُن دنوں بہت مقبول ہو چکی تھیں۔ لیکن مجھے ان میں کوئی خاص نئی بات نہیں سُنائی پڑی تھی۔ ہاں مقامی اخباروں میں شاعر کی جو چیزیں پڑھی تھیں، اُن میں سے دو ایک مجھے بہت اچھی لگی تھیں۔ 'شوقہ سان دِلہ کِس ربابس تارہ لولچہ چارہا' میں تو مجھے کشمیری شاعری کی ایک نرالی لے سُنائی دی تھی۔ خاص کر ان شعروں میں:-

یود شہ دلبر سرشہ ترآوِتھ سیہ دمہ کُن کرِ ہے نظر
شرادنس زن ہی بو پھولہ ہا یاونس ژھوہ مارہ ہا

کامہ دیو کرِ سیرِ ڈل بُوزم شبس گژھہ تیسل بل
درشنس آبس اندر پمپوشس لاگِتھ پرارہ ہا

سوز بوز نہ پانہ ییہ ہے بوز ہے میانی دداکھ
شوقہ سان دِلہ کِس ربابس تارہ لولچہ چارہ ہا!

(کاش وہ دلبر کدورت چھوڑ کر میری طرف سیدھی آنکھ دیکھے۔ تو میں دن کی چمیلی سی کِھل اُٹھوں، میرا جوبن پھولا نہ سمائے۔)

(سُنا کہ کامہ دیو (محبوب) ڈل کی سیر کو جا رہا ہے۔ اور تیل بل میں رات کاٹیگا، اُسکے درشن کے لئے میں (ڈل کے) پانی میں کنول بن کر انتظار میں رہوں!)

اسی غزل نے مجھے مہجورؔ کی عظمت کا قائل کر دیا تھا۔ اسی لئے بھانڈوں سے اُس کا کلام سُن کر میرا جی للچایا کہ اور بھی سُن پاؤں۔ میرے اصرار پر انہوں نے جو غزلیں سُنائیں، اُن میں سے 'کیا سنا ییہ ناسُو دلبر رد کے زیبا ہا دنا، سوزِ دل میون بوزی و نہ ہارُے'، اور 'کرو بُلبُلو دیدارِ گُل'، میں مجھے ایک تازگی کا احساس سا ہوا۔ 'کرو بلبلو دیدارِ گُل' کے کچھ اشعار تو آج بھی مجھے اچھے لگتے ہیں۔

"پوشن چھُم کمُ تُند انتظار   کس کیوت چمن سیدان تیار
تھرہ بیٹھ چھ گمیت تازہ گُل   کرو بُلبُلو دیدارِ گُل"
"مہجورؔ درشعرو سخن   گلگوں سین، گُل جبین مہ بن

ادہ چھکھ ، ژہ دعویٰ دارِ گُل   کرو بُلبلو دیدارِ گُل "

(پھولوں کو کس کا انتظار ہے ؟ کس کے لئے چمن سج رہا ہے ؟)

(ٹہنیوں پہ پھول بے قرار ہو رہے ہیں ، بُلبل دیدارِ گُل تو کر !)

(مہجور ! شعر و سخن میں گلگوں بن ، گل چین نہ بن ، تبھی تو گُل کا دعویٰ دار گردانا جائیگا)

مہجور کے اس صحت مند اور حسین لنظریے نے میرا من موہ لیا تھا۔ میں اُسکے تازہ کلام کیلئے ہمہ تن گوش ہونے لگا۔ کالج کھُلنے پر سرینگر لوٹ آیا ، تو معلوم ہوا کہ اُن دنوں شاعر ہندواڑے میں پٹواری تھا ، اور اپنے گاؤں بتردا گام جاتے وقت کبھی کبھار ہی دو شہر میں قیام کرتا ۔ اسی لئے اُس سال شاعر سے ملاقات کرنے کا میرا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا ۔ پھر بھی اُس کی غزلیات کے تین چھوٹے سے مجموعے پڑھنے کا شرف حاصل ہو ہی گیا ۔ انہی دنوں (کالج کے) پرتاپ میگزین کا کشمیری حصہ ترتیب دینے کا کام میرے ہاتھوں میں آگیا اور شاعر کی اہمیت میرے لئے اور بھی بڑھ گئی ۔

چند ہی ماہ بعد مہجور کی ایک نئی غزل شہر کے بچے بچے کی زبان پر سُنائی دی ، جس نے مجھ پر جادو سا کر دیا ، اور میں کئی دن اکثر گنگناتا رہا ۔

سُلہ گژھو بیدار گُل بوستانے   بُلبُل سُند افسانے بوز

گاش آو مُتراو چشم متانے   بُلبُل سُند افسانے بوز

(سویرے سویرے جاگ اُٹھ اور گُل بوستاں ، بُلبُل کے افسانے سُن ۔ پو پھٹی کھول دے مست نہ آنکھیں ، بُلبُل کے افسانے سُن !)

مجھے ایسا لگا جیسے شاعر خود بُلبُل بن کر اپنے وطن کے گلوں کو صدیوں کی نیند سے جگا رہا ہو ۔

حُسن اور عشق کی حیات پرور رنگینیوں کا جو دلفریب اظہار مجھے مہجور کی غزلوں میں ملنے لگا تھا ، اُس سے میں اُس کا اور بھی مداح ہوتا گیا ۔ اور "گریس کور" (کسان کنیا) جیسا فن پارہ پڑھ کر تو میں اُسے کشمیری زبان کے لئے ایک بیش بہا نعمت سمجھنے لگا ۔ فطرت کی آزاد فضاؤں میں پروان چڑھنے والے غیر مصنوعی حُسن کی پتلی کس خندہ پیشانی سے مشقت کی سختیاں جھیلتی ہے ، اس کا ایک دلکش بیان مجھے اس نظم میں ملا ۔ اور شاعر کی دُور رس صلاحیتوں کا ایک روشن اشارہ بھی ، اسکا نیا شعور ان تصویروں میں سے جھانک رہا تھا ۔

ژہ تہ خوجہ باین تِھا برابر ئے   ژہ گلن سیتی دلبر ئے

خوجہ بایہ ژو پرفقہ دارِ تہ بُرئے   گریس کور نازنین سوندر ئے

دچھ پٹھ دچھ کنھ تھو اندفقہ زئے   لولہ کیان لولہ ئے

ژہ مالوستے ژوُر کرِ کرُئے   گریس کور نازنین سوندر ئے "

(تیری اور خوجہ مستورات کی برابری ہی کیا ؟ تو گلوں کی ہم جولی ہے خوجہ مستورات تو در دریچے بند کر کے اندر ہی بیٹھی رہتی ہیں ۔ اے کسان کنیا ، نازنین ، سندری ! اور کھیت پر تجھے دیکھا ، آستین چڑھائے تھی ۔ لولری تو ، لولو گنگنا رہی تھی گوڑی کرتے کرتے تیری باہیں تھک تو نہیں گئیں ؟)

آستین چڑھائے گوڑی کرتی ہوئی کسان کنیا کا لولو گنگنانا مجھے ورڈسورتھ (Wordsworth) کی سولٹری ریپر (Solitary Reaper) کے سنگیت کی طرح بھی کم دلکش نہیں لگا ۔ بلکہ کسان کنیا کے محنت کشانہ تن من کی یہ جھلکی مجھے بہت اچھوتی دکھائی دی ۔

کہ نہ زنہ زن چھہ کالہ ابرک تُھر ئے

(مانو کاتک کے چاند کو کالے بادلوں نے گھیر رکھا ہو ۔)

سنہ ۱۹۳۰ء میں مطلق العنانہ حکومت کے ساتھ کشمیری عوام کی جو شدید ٹکر ہوئی ، اُس نے مہجور کے انقلابی شعور کو اور بھی جِلا بخشی ۔ " ولو ہا باغوانو نو بہارک شان پیدا کر " میں اُس نے باغبان کو جو دعوتِ عمل دی ، اُس میں کشمیری عوام کے لئے بیداری اور جد و جہد کا ایک نیا پیغام تھا ۔

چمن ویران روان شبنم ، ژٹتھ جامہ پریشان گُل

گلن تہ بلبلن اندر دوبارہ جان پیدا کر

اگر چھُو زہ نادھن بستی گلن منز تراو زیر و بم

بُنیول کر ، واو کر ، گگرایہ کر ، طوفان پیدا کر

(چمن ویران ہے ، شبنم آنسو بہا رہی ہے ، گُل جامہ چاک کئے پریشان ہے ، گلوں اور بُلبلوں کے اندر دوبارہ روح تو پھونک دے !)

(اگر تو گلوں کی بستی کو جگانا چاہتا ہے تو زیر و بم کو تلاطم کی دے ، بھونچال لا ، آندھی اُٹھا ، گرجتا جا اور طوفان مچا !)

مہجور کی یہ للکار کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی سرگرم عمل کشمیری عوام کا ڈھارس بندھاتی رہی مجھے اچھی طرح یاد ہے ، اُن دنوں قومی تحریک کے سلسلے میں جتنے بھی جلسے ہوئے ، اُن کی کاروائی اسی ترانے سے شروع کی جاتی اور اس طرح مہجور کی یہ غزل ہمارا قومی ترانہ بن گئی ۔

اب میرے سامنے شاعر کا ایک اور ہی روپ اُبھرتا گیا ، میں حیران [illegible]

وعشق کے دلربا نغمے الاپنے والا ایک پجاری انقلاب کا اتنا پُرجوش ترانہ کیسے گا سکا تھا۔ شاعر سے ملنے کی میری تمنّا اور بھی بے قرار ہو اُٹھی۔

انہی دنوں مجھے ایک مکالمہ جو دیوندر ستیارتھی نے مہجور پر لکھا تھا، پڑھنے کا اتفاق ہوا، اس کے ساتھ ان کی تصویر بھی شائع کرائی گئی تھی۔ مجھے "وشو بھارتی پتر کا" (کلکتہ) میں چھپا "پوشہ متہ جانانہ" کا (پنڈت آنند کول بامزئی کا) انگریزی ترجمہ بھی ملا، جسے ٹیگور نے بہت سراہا تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد برِاج ساہنی کا وہ مضمون بھی پڑھنے کو ملا جس میں اُس نے مہجور کی شاعری کا جائزہ لیا تھا۔ شاعر کی یہ عزت افزائی دیکھ کر میں مسرت سے پھُولا نہیں سمایا۔

مہجور ان دنوں سرینگر بہت کم آتا تھا۔ لیکن میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا، جب جون ۱۹۴۱ء کو ایک دن میری دیرینہ خواہش پوری ہو ہی گئی۔ میں ہری سنگھ ہائی سٹریٹ سے جا رہا تھا کہ آگے سے شاعر آتا دکھائی دیا۔ "کلامِ مہجور" کے سرورق پر میں نے اُس کی تصویر دیکھی تھی۔ بھاری بھرکم سفید دستار، جھریوں سے مزیّن چوڑی پیشانی، گھنی بھوؤں کے نیچے چمکتی ہوئی آنکھیں، ستواں ناک، کچھ کچھ چھوٹی مونچھیں، بولتے سے ہونٹ اور ہنس مکھ چہرہ — سبھی کا اشارہ تھا یہی تو مہجور ہے!

میں بے صبری سے بول پڑا — "آداب عرض مہجور صاحب!" شاعر نے بڑی حلیمی سے جواب دیا — "آداب عرض، سُنائیے، اچھے ہیں؟"

مجھے ایسا لگا کہ میں اُسے برسوں سے جانتا تھا۔ ایک ہی سانس میں بولا — "آپ کی عنایت! سُنائیے کب تشریف لائے؟ آپ سے ملنے کی زبردست خواہش تھی۔ دیرینہ خواہش۔"

مہجور نے مسکرا کر پوچھا — "کہیے کیا حکم ہے؟"

"آپ کا کلام پڑھ کر آپ سے ملنے کو بیتاب تھا!"

اپنی کمر کو لاٹھی کے سرے کا سہارا دیتے ہوئے شاعر بڑی نرمی سے بولا "یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ کو میرا کلام پسند آیا۔ آپ کالج میں پڑھتے ہیں؟"

میں نے جھینپ کر جواب دیا — "جی نہیں، ان دنوں کانونٹ کالج میں پڑھاتا ہوں۔"

مہجور کی آنکھیں دمک اُٹھیں، بڑے تپاک سے کہنے لگے — "اوہ! معاف کیجیے۔ آپ سے مِل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

مہجور نے بائیں ہاتھ سے ٹھوڑی کو کھجلاتے ہوئے بڑے پیار سے کہا — "چلیے۔ کہیں ضروری کام تو نہیں جا رہے ہیں؟"

مسحور سا میں چُپ چاپ اُس کے ساتھ ہو لیا۔ ٹانکی کدل والے اُسکے مکان کی چھوٹی سی بیٹھک میں اُس دن پورے دو گھنٹے طرح طرح کی ادبی اور تہذیبی بات چیت ہوتی رہی۔

کچھ دیر تک کشمیری شاعرہ حبہ خاتون کا تذکرہ رہا۔ میرے سوال کا وہ بہت متانت اور سلیقے سے سلجھا ہُوا جواب دیتا رہا۔ اُسی روز مجھے اُس کی ابتدائی زندگی میں جھانکنے کا بھی موقع ملا۔ یہ جان کر مجھے تعجب ہوا کہ پیرزادہ ہوتے ہوئے بھی وہ بچپن سے ہی مذہب زدگی اور توہم پرستی کے خلاف نبرد آزما رہا تھا۔ عربی فارسی کی روایتی تعلیم پا کر بھی اُس نے پیر بننے سے انکار کر دیا تھا، اور گھر کے گُھٹے گُھٹے ماحول سے اُکتا کر وہ ۲۰ سال کی عمر میں اپنے گاؤں (مِتری گام) سے بھاگ نِکلا تھا۔ لاہور میں جا کر اردو شعر کہنے لگا تھا، اور مہجور تخلص کیا تھا۔ امرتسر میں مولانا شبلؔی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا — "یہ ہجر کس سے؟" مہجور نے جواب دیا تھا — "اپنے وطن سے!"

شبلؔی نے پھر سوال کیا: "اور وطن لوٹنے کے بعد؟" مہجور بولا — "آپ سے!"

اُس کی اس حاضر جوابی سے شبلؔی بہت متاثر ہوئے تھے۔ آخر ۱۹۰۷ء میں جب وہ کشمیر لوٹ آئے تو اُس نے محسوس کیا کہ کشمیری زبان کو اپنا کر ہی اُسکی شاعری اپنے معراج کو چھُو پائیگی۔

مہجور نے مجھے یہ بھی بتایا کہ بچپن میں مقبول شاہ کرالہ واری کی "گلریز" کے شاہزادہ عجب الملک اور نوش لب کی داستانِ عشق اُسے بہت پسند آئی تھی۔ بعد میں محمود گامی اور اس سے بھی زیادہ رسول میر کے تغزل نے اُسے متاثر کیا تھا۔ لیکن سب سے پہلے کشمیری میں شعر کہنے کی تحریک اُسے ۱۹۱۷ء میں حبہ خاتون کے ایک مقبولِ عام گیت سے ہوئی تھی۔ گاؤں کی کسان لڑکیاں میدان میں ساگ چُنتی ہوئی گا رہی تھیں۔

"گوشن منز ہا دھراوَے ولو میانہِ پوشہ مدنو"

(کنجوں میں تیرے لئے فرش کر دوں گی۔ آجا میرے پھول پیارے مدن (محبوب)!

اور اِسے سُن کر مہجور بھی گنگنانے لگا تھا۔

"ژولہما روشہ رو شے پوشہ متہ جانانو"

اپنی ابتدائی غزلوں میں گُل وبُلبُل کی اشاریت پر روشنی ڈالتے ہوئے شاعر نے کہا۔ "اُن دنوں میرے سامنے یہی سوال تھا کہ کشمیری زبان کی طرف پڑھے لکھے لوگوں کو کیسے رجوع کیا جائے۔ اسی لئے میں نے گُل وبلبل کی شاعری کو ہی نئے رنگ و روپ میں پیش کیا۔"

اس پر میں نے اُسی کا ایک مصرع سُنا دیا۔

"لولہ سازس تازہ لَے ہیتھ آیہ مہجورن غزل"

(محبت کے ساز پر تازہ لَے لیکر ہی مہجورؔ کی غزلیں آگئیں، !)

شاعر کے پُر جلال چہرے پر معصوم بچے کی سی بھولی مسکان کھِل اُٹھی اور 'پیامِ مہجورؔ' میں سے اُس نے ایک پیارا بند سُنایا۔

" دندہ ژلہ شین گلہِ ییہِ ییہِ بہار
مہجورہ لولک ساز تھو تیار ...
گُل پھولن پانئے ژہ ذرا بہانہ بن
جان بن جان بن جانانہ بن!"

(جاڑہ بیت ہی جائیگا، برف پگھل ہی جائے گی، بہار پھر سے آئیگی، مہجور! سازِ محبت تیار تو رکھ۔ پھول کھلیں گے آپ ہی، ذرا بہانہ تو بن، پیارا بن، پیارا بن، جاناں بن!)

اس پر مجھے انگریزی شاعر شیلی کے غیر فانی الفاظ یاد آگئے۔

"If winter comes
Can spring be far behind!"

(اگر جاڑہ آتا ہے تو بہار کو آتے دیر لگیگی کیا؟")

شاعر کو میں نے اس کا ترجمہ سُنایا، تو اظہار کی اس یگانگت سے بہت محظوظ ہوا۔ اس سے پہلے اُسے شیلی کے بارے میں سُننے کا کبھی بھی موقعہ ہی نہیں ملا تھا۔ اس لئے اثر پذیری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

خیر کشمیر کی سیاسی زندگی پر تو جاڑے اور بہار کی یہ اشاریت بہت ہی موزون تھی۔ اس لئے میں نے شاعر کی کئی اور غزلوں کی اشاریت کے بارے میں بھی اپنا ذہن صاف کرنے کی کوشش کی۔ ایک غزل میں شاعر نے کہا تھا۔

"وتہ ییانِ وُچھہا وارہ نظرن راچھہ چھم کم تام
بوزم ون کرنم راچھہ دِلہ چھے رایہ وَنے کیا"

(میں جی بھر کر نہیں رہ سکتا، مگر میری نظروں میں کسی کی کڑی نگرانی ہے۔ سُنتی ہوں کہ اب میرے دل کی رائے پر بھی پہرہ بٹھایا جائیگا!)

میں نے جھجھکتے ہوئے پوچھا۔ "اس مصرعہ میں آپ نے محض عاشقوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے یا کہ ملک کے سماجی، سیاسی ماحول کو بھی جھلکایا ہے؟"

اس پر وُہ ہنس پڑا اور بولا۔ "یہ بتانا تو آپ جیسے نقادوں کا کام ہے مجھ جیسے شاعروں کا نہیں۔"

کس حُسنِ اخلاق سے شاعر نے نقاد سے پنڈ چُھڑا لیا!

دو گھنٹے کی اس ادبی گفتگو کے بعد میں نے مہجورؔ کا دِلی شکریہ کیا۔ اور وداع مانگی تو بولا۔ "بس؟ تھک گئے؟ چائے پی کے جائیگا!"

میں نے بھی اُسی انداز سے جواب دیا۔ "جی، میں تو تھکنے کا نام نہ لوں، ڈرتا ہوں کہیں آپ کو تھکا نہ دیا ہو!"

تو میرا ہاتھ پکڑ کر وُہ پیار سے بولا۔ "بالکل نہیں، بالکل نہیں، بیٹھ جایئے دیکھتے ہیں کون پہلے تھکتا ہے!"

بیٹھک قہقہوں سے گونج اُٹھی، اور میں آداب عرض کرکے چلا آیا۔ جاتے جاتے میرے تصور میں رہ رہ کر اُس کمرے کے نقوش اُبھرتے رہے۔ چاروں طرف کتابیں، کھڑکی کے پاس گھِسی ہوئی دَری پہ گاؤ تکیہ کا سہارا لئے ہمارا محبوب شاعر شیریں کلامی میں بھولی مُسکراہٹیں گھول رہا ہے۔ آج بھی وُہ تصویر میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوند جاتی ہے اور اُس کے بعد چلتی پھرتی تصویروں کا ایک چکر سا گھوم جاتا ہے جس میں بعد کی کئی ایک ملاقاتوں کے مرقع بھی کھُل پڑتے ہیں

۱۹۴۶ء تک مہجورؔ کی شاعری نئی ڈگر پر بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ 'کاشُر زنانہ' 'دنیائے تراَوِہ مائے تھاوِد کاشُرو' 'آرہ ولن منز' 'باغوانا مہر بانا'، 'زون' 'تازہ یاوُن چھم' 'نوِ کشیر' 'سنگرمالن پیو پراگاش' اور 'یِہ بوز لَے تھوَ زمانس سیت' جیسی بڑھیا چیزیں ۱۹۴۲ء — ۴۶ء میں ہی لکھی گئی تھیں۔ ان میں نئے دَور کے نئے شعور کا جو پُر اُمید اور جوش بھرا پیغام پھُوٹ پڑا وُہ ہنگامی ہوتے ہوئے بھی دیرپا ہے۔ 'نئے کشمیر' کی تعمیر کو اس سے تقویت پہنچی ہے اور پہنچتی ہی رہیگی۔ اُس نے ہم یہ احساس جگایا ہے کہ۔

" وارہ وارہ دارِل گژھن نابود بُلبُل تہ کستور واین سرُود
باغ کرِسو رگس بیئت مان مان ...
یلہِ کھیہِ تو سمتا رُک رَو گوڈہ پییہِ چانی ڈیہِ پرتو
ادہ گژھہ روشن سوروی جہان

(دارِل. جیسے خونخوار شکاری پرندے دھیرے دھیرے نابود ہو جائیں گے بلبلیں اور کستوریں سرود بجائیں گے، ہمارا باغ سورگ سے ٹکر لے گا۔)
(جب نئے زمانے کا سورج چڑھیگا تو پہلے تیرا ہی دالان جگمگ جگمگ کر اُٹھیگا بعد میں سارا جہاں منوّر ہو اُٹھیگا۔)

کیونکہ —

"ہر دُک طوفان پوشہ تھرہ زالن   سونت ییہ دوہہ اکہ تُلہ پُرخاش
شوِی پھولہ تن پُش دِیہ جنجالن   سنگرمالن پیو پراگاش"

(پھول کی ٹہنیاں خزاں کے طوفان کو برداشت کرلیں گی، تو ایک روز بہار لوٹ آئیگی تو اُن کے بارے میں ضرور باز پُرس کریگی۔ وہی نوچھپلیگا جو مصیبتوں سے جی نہیں چُرائیگا۔ کیونکہ پہاڑوں کی برفانی چوٹیاں (نئے دَور کی نئی روشنی سے) جگمگ جگمگ کر اُٹھی ہیں!)

اور جس نئے کشمیر کیلئے مسلسل کوشاں رہنے کی تلقین مہجور نے کی ہے اُسکی یہ جھلکیاں منصوبہ بندی کے موجودہ دَور میں ہمارے دِل و دماغ کو روشن کرتی ہی رہیں گی۔

"شنیاہ چاٹِن نہ سہ روزن شنیاہ شنیاہن اندر بسہ نوی دُنیا
گلشن بنہ ویرانا ....
ارخلس پیوند دِن دِیوہ دارِک، ویرِ ہچہ آسے دِن ژندن دارِک
سارِسی بنہ یکسانا!
ہتھیار کھولن مذہب دارن، بنہ بوربنہ تِم اکھ اکس مارن
مذہب روزہ اکھ نشانا!"

(تیرے ویرانے ویرانے نہیں رہیں گے، وہ گلشن بن جائیں گے، اور اُن کی جگہ ایک نئی دنیا آباد ہو جائیگی .... (جہاں) کانٹے دار (زہریلے) پودوں کو دیودار کا پیوند لگایا جائے گا۔ بید کی لکڑی کو چندن کی پائداری عطا ہو گی، اور سب کی ایک سی قدر ہو گی!)

(مذہب داروں کے ہتھیار کھول لئے جائیں گے تاکہ آئندہ وہ ایک دوسرے کا کام تمام نہ کر بیٹھیں، مذہب محض ایک نشانی رہ جائے گا!)

قبائلی حملے کے دنوں میں جموں میں تھا، لیکن ۱۹۴۹ء کی گرمیوں میں میں نے شاعر کو دیکھا تو اُداس پایا۔ پٹواری کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے اُسے چار پانچ سال ہو چکے تھے، پنشن ۱۵ روپے ماہوار سے کم ہی بنتی تھی، ایکطرف یہ اقتصادی صورت حال اور دوسری طرف کس مپرسی کا ماحول، شہر میں اُس کا دل لگتا تو کیسے؟ ۲۲ میل دُور اپنے گاؤں (مِتری گام) میں الگ تھلگ رہ کر وہ اپنے قریبی دوستوں اور قومی زندگی سے بھی دُور دُور ہونے لگے تھے۔ مجھے یہ دیکھکر بڑا دُکھ ہوا کلچرل کانفرنس کے کارکنوں سے اُس کا رابطہ بنائے رکھنا نہایت ضروری تھا۔ لہذا موقع پاکر ایک روز نادم اور چوہان کو بھی مہجور کے گھر لیگیا۔ کھُل کر باتیں ہوئیں۔ 'یوم مہجور' منانے کا فیصلہ ہوگیا۔ بڑی مُشکل سے مہجور ۲۳ ستمبر ۱۹۵۰ء کو سرینگر آنے پر راضی ہوگیا۔ 'یوم مہجور' بڑی دھوم سے منایا گیا۔ ریڈیو کشمیر سرینگر سے شاعر نے اپنی ایک تازہ نظم 'ولو ہا پوشہ نولو' نشر کی۔ اُس کی شاعری پر ایک سنگیت روپک پیش کیا گیا۔ اور محکمہ ریڈیو کی طرف سے اُسے ایک تھیلی بھی نذر کی گئی، رات کو کلچرل کانفرنس کے دفتر (نمائش گاہ) پر ایک بھاری جلسہ ہوا جس میں شاعر کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ اُس کی زندگی اور شاعری پر روشنی ڈالی گئی اور غنائیے پیش کئے گئے۔ اُس تہذیبی تقریب کی صدارت کرنے کا جو خوشگوار شرف مجھے ملا اُس پر مجھے ہمیشہ فخر رہیگا، کیونکہ اُس روز اپنے محبوب شاعر کی پینسٹھویں سالگرہ پر ہم ایک ادبی جشن منا رہے تھے۔ اُس روز مہجور نے پہلی بار محسوس کیا ہوگا کہ اَن پڑھ عوام ہی نہیں، پڑھے لکھے کشمیری بھی اُسکی قدر و قیمت جاننے لگے ہیں اور کشمیری زبان کی ادبی صلاحیتوں کے قائل ہو رہے ہیں۔

اپنے خطبے میں اُس نے اپنی شاعری کے اُتار چڑھاؤ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں خوش ہوں کہ اب میرے شروع کئے ہوئے کام کو جاری رکھنے والے نوجوان شعرا کی کمی نہیں رہی ہے!"

اُس وقت کِسے معلوم تھا کہ ڈیڑھ سال کے اندر ہی وہ اپنے ادھورے کام کو پورا کرنے کی ذمہ داری اپنے ساتھیوں پر ڈالکر ہمارے بیچ سے چل دیگا! ابھی ہمیں اُس سے بہت کچھ حاصل کرنا تھا۔ نیا کشمیر کے بارے میں اس کا شعور کتنا پختہ اور سلجھا ہوا تھا، یہ دیکھنا ہو تو 'ہا گُلِ لالو' 'آبِ آزادی' 'مادر منز سائِن البانئے' اور 'پوشہ نولو ہوشہ سان روز' کا بغور مطالعہ کرنا ہوگا۔ عبوری دور میں جو بےضابطگیاں اور دھاندلیاں مچتی رہیں اُن سے وہ برابر ٹکر لیتا رہا، جبھی تو اُس کی شاعری کا طنزیہ انداز نکھرتا گیا اور اُس کی اجتہادی آواز گھمبیر ہوتی گئی۔ مجھے یاد ہے کہ کلچرل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں جب اُسکی 'لالو لالو ہا گُلِ لالو' پڑھکر سُنائی گئی تو چاروں طرف سنّاٹا چھا گیا تھا، حاکم شاہی کے علمبردار دم بخود ہو گئے تھے اور سچی جمہوریت کے حامی سر دُھن رہے تھے

1949

"تتہ تہِ چھا انسان مارنہ باپتھ انسان گران ہتھیار
تتہ تہِ چھا زنانن معصوم بچن پیٹھ انسان کران بمبار
تتہ تہِ چھا آلڈھن رنگہ رنگہ نعمژ کمہ لین لگان ہتہ مار
تتہ تہِ چھا زیوہ زیبٹھ بتہ سازندر دورہ وان موٹرکار
تتہ تہِ چھا گونہ ماتھ صبحس کونان راتھ ازغلس ونان دیوہ دار
تتہ تہِ چھا مہجور تنہا بیہتھ دُور کو کرن چھکان مختہ ہار!"

(وہاں بھی انسان کی نیست نابودی کے لئے انسان ہتھیار گھڑتا ہے کیا ؟)
(وہاں بھی عورتوں اور معصوم بچوں پر انسان بم باری کرتا ہے کیا؟)
(وہاں بھی نکموں کو طرح طرح کی نعمتیں مہیا ہیں کیا؟ اور کامگاروں کو بھوکوں مارا جاتا ہے ؟)
(وہاں بھی زبان دراز (چاپلوس) نکھٹو موٹریں دوڑاتے پھرتے ہیں کیا؟)
(وہاں بھی فن کار صبح کو رات جتلاتے ہیں اور "نقبہ بر" کو دیودار بتاتے ہیں کیا؟)
(وہاں بھی مہجور تنہائی میں دُور بیٹھ کر مرغیوں کے سامنے موتی بکھیر رہا ہے کیا؟)

(آزادی کو من مانی کا مترادف سمجھنے والے شر پسندوں کو ٹوک کر شاعر نے اُس وقت ایک بہت اہم فریضہ انجام دیا۔ اور آزادی کے بارے میں عوام کا ذہن صاف کرنے کی کوششیں کیں۔ جس آزادی کے لئے قوم نے اتنی قربانیاں دی تھیں اُس کو استوار کرنے کے لئے مہجور نے سماج دشمن عناصر کو یوں آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

"یہ آزادی چھ سورگچ حور پھیریا خانہ پتھ خانہ
فقط کینژن گرین اندر چھہ ماران گرایہ آزادی ..."

(یہ آزادی سورگ کی حور ہے، گھر گھر گھومتی پھرے تو کیسے؟ یہ تو فقط کچھ ایک ہی گھروں کے اندر رقص کرتی پھرتی ہے۔ غریب عوام تو بے حال ہیں اور حاکم دولہوں کی طرح بن ٹھن کر بیٹھے ہیں۔ انہوں نے آزادی (کی دلہن) کو خلوت گاہوں میں (اپنے ہی لئے مخصوص کر) رکھا ہے)

جو شاعر اس چابک دستی اور بے باکی سے عوامی جذبات کی ترجمانی اور عکاسی کر سکتا ہے۔ اُس کا ہم سے چھین جانا ہمارا ایک قومی المیہ ہیں تو کیا ہے؟ لیکن جیسا کہ میں نے "یوم مہجور" کے خطبہ میں کہا تھا ہمیں خوشی ہے کہ اب اُن کے شروع کئے ہوئے کام کو جاری رکھنے اور آگے بڑھانے کا تہذیبی فرض انجام دیکر ہی ہم اپنے محبوب شاعر کو صحیح خراج عقیدت پیش کر سکیں گے۔ مہجور کی یاد کا

جُرمِ وفا

"آزاد کشمیر" کے با اثر ہفت روزہ اخبار "کشمیری" کے مدیر مسٹر [redacted] نے یہاں پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے حالات کے بارے میں سنسنی خیز انکشافات کئے۔ اخبار کے ایڈیٹر اور ان کے دو ساتھیوں مسٹر دنی محمد ڈل اور مسٹر عمر الدین کو پاکستانی فوج اور مغربی پنجاب آرمڈ کنسٹبلری کے سپاہیوں نے سنگینوں کے بل پر سرحد کے اس پار دھکیل دیا ہے۔ خواجہ صاحب کے ساتھ جو دو رفقاء سرحد پار کر گئے ہیں یہ مظفر آباد کے محکمہ جات رفاہ عامہ اور جنگلات کے ٹھیکیدار ہیں۔ پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے اس ایڈیٹر نے دلدوز اور درد بھرے لہجے میں اس ڈرامائی صورت حال کا ذکر کیا۔ جس میں اُنہیں اور ان کے دوسرے شرکاء کو مقبوضہ علاقہ سے باہر کیا گیا ہے۔ خواجہ ثناء اللہ نے کہا کہ حال ہی میں جب برطانوی پارلیمنٹ کے دو ممبر مسٹر فریڈرک بینٹ اور مسٹر فرینک ٹامنی پاکستان کا دورہ کرتے ہوئے "آزاد کشمیر" پہنچے تو وہ اور اُس کے دوسرے رفقاء نے ۸ مارچ مظفر آباد کے گیسٹ ہاؤس میں اسی دن ساڑھے چار بجے ان سے ملاقات کی۔ اور انہیں "آزاد کشمیر" کے عوام کی دُکھ بھری حالت سے متعلق کچھ لٹریچر اور دستاویزات پیش کئے۔ اور اس ظلم و ستم کا حال سُنایا جو اس بدنصیب علاقہ کے لوگوں پر مقامی اور پاکستانی حاکم ڈھا رہے ہیں۔ خواجہ ثناء اللہ نے کہا کہ برطانوی پارلیمنٹ کے ممبروں کے ساتھ اُنکی ملاقات کے وقت وہاں حکومتِ پاکستان کے دو انفارمیشن آفیسر اور کئی دوسرے آفیسر بھی موجود تھے۔ اخبار "کشمیری" کے ایڈیٹر نے بیان کیا کہ کانسٹبلری کے ڈیڑھ سو سپاہیوں نے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ شیخ اقبال کی سرکردگی میں اُن کے گھروں میں چھاپہ مار کر اُنہیں حراست میں لیکر ایک دُور دراز مقام پر پہنچایا۔ اور سرحد پار کرنے کا حکم دیا گیا۔ خواجہ صاحب نے کہا کہ ہمیں جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی گئی۔ اس لئے ہمیں سرحد پار کئے بغیر اور کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ "آزاد کشمیر" کے اس ایڈیٹر نے بتایا کہ آرمڈ کانسٹبلری کا جو اسسٹنٹ سرحد تک اُن کے ساتھ آیا اُس نے اُنہیں سرحد کے اس پار دھکیل دینے پر اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ انہیں اللہ نواز کریم خان انسپکٹر جنرل پولیس کے احکام کے تحت ایسا کرنے کو

غلام نبی خیال

نذرِ مہجورؔ

زندگی ہُند مس تمیٔ چیٚیہ یُس بنیوو مستانہ چون
پچھ تماہ تس دراے یس حاصل سپُد یارانہ چون
بان دُب دُب کرِہ لوگ دِل نان روٹ دامانہ چون
"ساقیا آباد روزِن تا ابد مے خانہ چون
آفتابکِ پأٹھِ پرزلِن دم بدم پیمانہ چون

لول گوٚو زُو جان ہارُن لولہ بازارس اندر
نظرِ تل تھاوِن چمن تیٚہ دِن ووٚٹھہ نارس اندر
زندگی ہِند ژانگ زالُن موتکس غارس اندر
"تیٚل لبُتھِ نزدیک پوشن جائے گلزارس اندر
نہٕ گژھِ یلہٕ پوشہ ٹھرِ تَل روٹ کنڈیو دامانہ چون"

بُلبُلن مشہِ نالہ زأری کارِ تھمَ ژلہِ سُنبلن
رنجکین ویران وَنن منز شادیانک گُل پھولن
یانہ منزل نادلاین دُور بیہتن قافلن
"یم زہ یُد باہم رلن اَدہ کوہ الن سنگر ڈلن
دردہ ہٕنت یم ہیاٚنِ آکو ساز تیٚہ سامانہ چون"

ترجمہ

زندگی کی شراب اُسی نے پی جو تمہارا مستانہ بن گیا۔
اُس کے ہزاروں ارمان پورے ہوئے جو تمہاری دوستی حاصل کر سکا
جب بھی دل دھڑکنے لگا تو رندوں نے تمہارا دامن تھام لیا۔
"میرے ساقی! تمہارا میخانہ ابد تک آباد اور سلامت رہے۔
میری تمنا ہے کہ تمہارا پیمانہ آفتاب کی طرح نُور افشاں ہو"

سودائے عشق میں جان کی متاع ہارنے کو ہی عشق کہتے ہیں۔
گُلستاں کو پیشِ نظر رکھکر آتش میں کود پڑنا چاہیئے۔
موت کے تاریک غاروں میں زندگی کے چراغ روشن کرنے چاہیئں۔
"تُو نے اُسی صورت میں چمن میں گُلوں کے ساتھ جگہ پائی۔
جب پہلے خارزاروں نے تمہارے دامن کو تار تار کیا۔"

بلبلیں گریہ وزاری بھول جائیں گی اور سُنبل کی گردن میں خم نہ رہیگا
رنج وغم کے اُجاڑ بنوں میں مسرت کے پھول کھلیں گے۔
جو قافلے ابھی منزل سے دُور ہیں منزل اُنہیں خود پکاریگی
"ان دو کا جب بھی ملاپ ہوگا تو کوہستان ہل اُٹھیں گے۔
میری درد بھری پکار اور تمہارا سازو سامان اے ساقی!"

چانہِ رویک بوزِ تھی پیوٚ نورہ پرٚتو سنگرن
یان وُٹھ چانہِ اسنہ لگِ پمپوش ہی پھل منز سرن
چون دامن یم رٹن تم مَس حیاتک باگرن
"ژ ار چھنہ پننین تہ پردین دیندارن کافرن
لولہ والین سارنی کیوٚت وتھ چھُو دسترخوان چھین"

وُچھ خیال از بیہ چھو وُزہ ناوان نمندِ میوٹھ سوز
بیت یمنِد ریشِ لیوٚ گیوٚ وارلیوٚ دیوٚت نوز نوز
یُس پران اوس ماگھسی منز نوبہارک نغمہ، بوز
"تازہ غزلاہ آو ہیتھ مہجور کن دار ختہ ژہ روز
نکتہ زاول بوزہ ناوان گاٹلین دیوانہ چون"

تمہارے رُخ کے بارے میں سُنتے ہی پہاڑوں کی چوٹیاں منور ہو گئیں
جب بھی تمہارے ہونٹوں پر تبسم آیا تو جھیلوں میں کنول کھل اُٹھے
تمہارا دامن جو تھام لیں گے وہ مُردوں کو جام حیات پلائیں گے
"تُو نے کبھی اپنوں بیگانوں یا دینداروں اور کافروں میں تمیز نہ کیا۔
تمہارا دسترخوان اے مرے ساقی! سبھی کیلئے بچھا رہتا ہے"
دیکھ کہ آج خیال پھر اُسی کے شیریں ساز کو چھیڑ رہا ہے۔
جس کے گیت بلبلوں نے گائے اور زاغ و زغن ہراساں ہوئے
جو جاڑوں میں ہی بہار کے نغمے سُناتا تھا، تو بھی سُن۔
"مہجور تازہ غزل لیکے آیا ہے گوش بر آواز ہو!
تمہارا دیوانہ نکتوں کو باریک گتھنے سنا رہا ہے اے ساقی!"

آبشار اہرہ بل

از مہجور کاشمیری

اہرہ بلچ نازنینِ ماہ پیکر ہی پان ژادر ہی
حُور سور گچھ یا پرستانچ پری پان ژادر ہی
چانِ تن نورک بدن ولہ ناوِ کم کار ہی گرن
ہیرہ بوٚنہ پانس جواہر کم جری پان ژادر ہی

غیر مطبوعہ
جولائی ۱۹۳۲ء
بمقام اہرہ بل۔ شوپیان

(ترجمہ:-)

اہرہ بل کے حسین آبشار تو ماہ پیکر ہے۔
یا جنت کی حُور یا پریوں کے دیس کی شہزادی۔
تیرے جسم پر نور کا پہناوا کس فن کار نے سجایا۔
اور تیرے سراپا کو کس نے جواہرات سے مالا مال کر دیا۔

سری نواس لاہوتی

کشمیری زبان کا عوامی شاعر ____ مہجورؔ

کشمیر کی خوبصورت وادیاں، دلکش مناظر، صحت بخش سبزہ زار اور رومان پرور جھیلیں ہمیشہ سے جنت نگاہ رہی ہیں شعراء نے اس پھولوں کی سرزمین کے راگ الاپے ہیں، افسانہ نگاروں اور فنکاروں نے اس بہاروں کی بستی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ سیاحوں نے اس حسن و جمال کی دنیا کے قصیدے پڑھے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس کشمیری عوام کی سماجی اور تہذیبی حالت انتہائی پست رہی ہے۔ اور اس کے کئی اسباب ہیں۔ یہ موقع نہیں ہے کہ اس پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی جائے۔ البتہ مہجور کے بارے میں کچھ لکھنے سے قبل پس منظر کے طور پر کشمیری زبان اور ادب کا مختصراً جائزہ لیا جائے۔ تو زیادہ مناسب ہوگا۔ تاکہ مہجور کی شاعرانہ عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

کشمیری زبان کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ پندرہ سو سال قبل آریاؤں نے یہاں بسنے والی جنگلی قوموں پر اپنا اقتدار جمایا اور ان پر حکمرانی کرنے لگے۔ ان لوگوں نے سنسکرت زبان کو اپنی "راج بھاشا" بنایا اور وہ تقریباً ایک ہزار برس تک کشمیری زبان کو متاثر کرتے رہے۔ لیکن اس کی بناوٹ اور اصلیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اور نہ اس کا اندرونی ڈھانچہ ٹوٹ سکا۔ کشمیری عوام نے سنسکرت زبان کی طاقت کے آگے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ بلکہ اپنی مادری زبان کی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ کشمیری زبان کا تھوڑا سا قدیم ادب ہمیں "شاردا" رسم الخط میں بھی ملتا ہے۔ جو غالباً اس وقت لاہور کے میوزیم میں محفوظ ہے۔ آج کل تو اس رسم الخط کا کہیں بھی رواج نہیں ہے۔ آریاؤں اور برہمنوں کے دور حکمرانی کے بعد مسلمانوں نے کشمیر کو فتح کر کے فارسی زبان کو سنسکرت کی جگہ رائج کیا۔ جس کی بناء پر فارسی رسم الخط کا بھی رواج پڑا۔ لیکن اس رسم الخط کی سب سے بڑی خامی یہ پائی گئی کہ صوتی اعتبار سے فارسی پورے طور پر کشمیری زبان کے لفظوں کو ادا نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے اس کے یہ اثرات دیرپا ثابت نہیں ہوئے۔ لیکن پھر بھی یہ اثرات اتنے گہرے تھے کہ آج تو نئے لکھنے والوں کے سامنے رسم الخط کا بہت ہی پیچیدہ مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک فارسی کا زور رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج یہاں پر شہروں میں فارسی آمیز کشمیری زبان بولی جاتی ہے۔

برہمنوں کے دورِ حکمرانی میں کشمیری زبان کے عوامی ادب کا کیا حال تھا اس کا کوئی مستند حوالہ ابھی تک مجھے نہیں مل سکا ہے۔ کیونکہ چودھویں صدی سے قبل کی تخلیقات شاید محفوظ نہیں رہ سکیں سلطان زین العابدین کے دورِ حکمرانی یعنی ۱۴۱۷ء سے ۱۴۶۵ء میں ایک مشہور شاعر کی لکھی ہوئی ایک نظم "بانا سر کتھا" ملتی ہے جو شاید کشمیری زبان میں کہی جانے والی پہلی نظم ہے۔ صوفی شاعرہ "لل دید" کشمیری زبان کی پہلی شاعرہ گذری ہیں۔ جنہیں کبیر داس کی طرح ہندو اور مسلمان دونوں ہی مانتے ہیں۔ یہ چودھویں صدی عیسوی کی بات ہے۔ اسی زمانے میں شیخ نور الدین اور سوم پنڈت نے بھی کشمیری زبان میں نظمیں کہی ہیں۔ مگر اس دور کی جس شاعری کا مجھے پتہ چلا ہے اس میں خواتین کی تخلیقات زیادہ نمایاں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مرد تو درباری ہو گئے تھے۔ اور وہ فارسی ہی میں اپنے خیالات کو پیش کیا کرتے تھے۔ اکبر نے جب کشمیر کو فتح کیا تو وہاں کی مشہور شاعرہ "حبہ خاتون" جن کے شوہر کو اکبر کے حکم سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس واقعہ کا شاعرہ پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ وہ جوگن بن کر گھر سے نکل گئی۔ اور پھر اس کا کہیں پتہ نہیں چلا۔ اس کی بہت سی نظمیں آج بھی عوام کی زبان پر چڑھی ہوئی ہیں۔ اسی طرح سے انیسویں صدی عیسوی تک ہندوؤں اور مسلمانوں نے مشترکہ طور پر کشمیری زبان اور ادب کو پروان چڑھایا۔

لیکن جس شخص نے آج سے سو سال پہلے جدید کشمیری ادب کی بنیاد رکھی اس کا نام "محمود گامی" ہے۔ اس نے کشمیری زبان میں ایرانی طرز پر "یوسف زلیخا"، لیلیٰ مجنوں، وغیرہ کی تخلیق کی۔ لیکن ان کی یہ تخلیقات فارسی سے مبرا کشمیری بھاشا میں تھیں اس لئے اعلیٰ طبقہ میں ان تصنیفات کو کوئی جگہ نہیں مل سکی۔ مگر اس کے بعد سے سینکڑوں ادیبوں نے اسی کشمیری بھاشا میں لکھنا شروع کیا۔ اس زمانے میں فارسی کا اتنا زور تھا کہ ان ادیبوں کی تخلیقات کو حکومتی ایوانوں سے یہ کہکر پھینک دیا گیا کہ "یہ صرف جاہلوں کی بکواس ہے"۔ پھر بھی سیف الدین اور سنتی پنڈت اس دور کے اچھے ادیب مانے گئے جن کی آج بھی قدر کی جاتی ہے۔ کشمیری زبان کی لوک کتھاؤں اور گیتوں کا سب سے اچھا اور نمائندہ مجموعہ ۱۸۹۳ء میں "جے ہنٹن نولے" نے مرتب کیا اسی طرح سے ۱۸۷۹ء میں پنڈت ایشور کول نے سنسکرت میں کشمیری لغت مرتب کی جو بعد میں گریرسن نے ۱۸۹۳ء میں اپنی زیر ادارت شائع کی۔ لیکن جب کشمیری عوام کا شعور بیدار ہونے لگا۔ تو انہوں نے کشمیری زبان اور ادب کی ایک مستند تاریخ مرتب کی اور آج بھی بہت سے لوگ اس زبان کے ادبی ذخیروں کی چھان بین کر رہے ہیں۔ اس مختصر سی تمہید اور پس منظر کے بعد اب ہم مہجور کی جانب رجوع ہوتے ہیں۔

موجودہ دور میں کشمیری زبان کے تین مشہور مانے گئے ہیں — مہجور، آزاد اور غلام حسن بیگ میں اپنے اس مضمون میں صرف مہجور کا ذکر کروں گا۔ کیونکہ کشمیری ادب میں ان کا بہت بلند مرتبہ اور مقام ہے۔ آزاد اور بیگ نے ان سے نہ صرف اکتساب کیا ہے بلکہ عوامی شاعر کے درجے تک پہنچنے کے لئے ان لوگوں نے مہجور کی رہنمایانہ سرپرستی بھی حاصل کی ہے۔

غلام احمد مہجور بہت ہی سنجیدہ شخصیت کے حامل انسان تھے۔ لمبا قد، گورا رنگ، آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی (۔ ایک نقاد کے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ "آپ (مہجور) اپنی شاعری میں فارسی الفاظ کا زیادہ استعمال کیوں نہیں کرتے؟" کہا کہ "اس سیلاب کو روکنے کے لئے قدرت نے مجھے پیدا کیا ہے"۔ ان کے اس بیان میں تصنع نہیں بلکہ حقیقت کی نمایاں جھلک پائی جاتی ہے۔)

ان کے والد سرزادے تھے۔ جن کی چھوٹی سی کھیتی باڑی بھی تھی ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی اس کے بعد یہ سری نگر میں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ان کے استاد خود شاعر تھے جن کا عاشق تخلص تھا۔ جو فارسی اور کشمیری زبان میں شاعری کیا کرتے تھے۔ ایک دن باتوں ہی باتوں میں انہوں نے مہجور کے متعلق یہ پیشین گوئی کی کہ "یہ لڑکا مستقبل میں بڑا شاعر ہوگا"۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مہجور اپنے وطن واپس ہوئے۔ تو والدین نے پیری مرشدی کی جانب انہیں متوجہ کیا، لیکن مہجور کو اس سے نفرت تھی، وہ نہیں چاہتے تھے، کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلایا جائے۔ والدین کو بیٹے کی یہ بات پسند نہیں آئی اور مجبوراً کمر عمری ہی میں مہجور کو گھر سے نکل جانا پڑا۔ اس وقت ان کی عمر (۱۷) سال کی تھی۔ ملازمت کی تلاش میں یہ آوارہ گردی کرتے ہوئے ۱۹۰۵ء میں لاہور پہنچے۔ یہاں سے امرت سر گئے اور خوشنویسی کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اسی زمانے میں ان کی ملاقات اس عہد کے بڑے بڑے شاعروں سے ہوئی۔ اس وقت اتفاقاً علامہ شبلی امرت سر ہی میں مقیم تھے۔ مہجور بھی ان دنوں فارسی میں شعر کہا کرتے تھے اس لئے ایک دوست کے ساتھ علامہ شبلی سے ملنے گئے اور ان کو اپنا فارسی کلام سنایا۔ علامہ شبلی نے ان سے مسکراتے ہوئے کہا کہ "آپ کا یہ تخلص کس کے ہجر کا اظہار ہے"۔ تو انہوں نے جواب دیا "اپنے وطن کے"۔ پھر علامہ نے دریافت کیا کہ "آپ کس سے دور پڑے ہوئے ہیں؟" مہجور نے کہا "اپنے وطن سے"۔ شبلی نے ان کے اشعار پسند کئے اور اپنے نزدیک بیٹھے ہوئے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا "یہ لڑکا ذہین ہے اور اپنے وقت کا اچھا شاعر ہوگا"۔

۱۹۰۷ء میں مہجور واپس سری نگر ہوئے۔ اس وقت چودھری خوشی محمد ناظر مہتمم بندو بست تھے۔ وہ خود بھی شاعر تھے۔ مہجور نوکری کی تلاش میں تھے۔ اس لئے انہوں نے ملازمت کی درخواست نظم کر کے چودھری صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ چودھری صاحب نوجوان شاعر کی اس قابلیت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور ان کو اپنے پاس رکھ لیا۔ جب وہ لداخ تشریف لے گئے تو مہجور کو بھی اپنے ساتھ لیتے گئے اور پٹواری گری کے عہدے پر مامور کر دیا۔ اس وقت انہیں آٹھ روپے ماہانہ تنخواہ ملا کرتی تھی۔ (۳۸) سال تک نوکری کرنے کے بعد

جب ان کے وظیفے کے دن قریب آئے تو ان کی تنخواہ میں ڈھائی گنا اضافہ ہوگیا تھا۔ یعنی انہیں بیس (۲۰) روپیہ ماہانہ تنخواہ ملنے لگی تھی۔ اپنی ملازمت کے آخری دور میں تنگدستی سے عاجز آ کر ملازمت کرنے کے بعد وظیفہ لے کر خدمت سے علیحدہ ہوگئے۔ اور عہد کیا کہ اب وہ اپنا سارا وقت کشمیری عوام اور ادب کی خدمت کرنے میں صرف کریں گے۔

مہجور نے اپنی شاعری کی ابتداء فارسی زبان سے کی۔ فارسی میں انہوں نے تقریباً (۷۰) نظمیں کہیں جو مجموعہ کی شکل میں ترتیب دی جا چکی ہیں۔ پتہ نہیں ان کے فارسی کلام کا یہ مجموعہ شائع بھی ہوا ہے یا نہیں؟ فارسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے اردو میں بھی شاعری کی اور ۱۹۲۰ء تک وہ اردو ہی میں لکھتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے کشمیری زبان میں لکھنا شروع کیا۔ ان کی اس تبدیلی کا ایک خاص پس منظر ہے اور وہ یہ کہ پٹواری کی حیثیت سے دیہاتی عوام کے ساتھ ان کا روزمرہ کا تعلق رہتا تھا۔ لیکن ناخواندہ عوام ان کی شاعری کو سمجھ نہیں سکتے تھے روزانہ بحیثیت شاعر کے مہجور کی ان کے نزدیک کوئی قدر تھی۔ اس لئے مہجور مجبوراً اپنے شیش محل سے جنتا کے درمیان اتر آئے۔ اور جنتا ہی کی زبان میں شاعری کرنے لگے (جب ان سے کسی نے سوال کیا کہ "آپ اردو اور فارسی کو چھوڑ کر کشمیری زبان میں کیوں شاعری کرتے ہیں تو انہوں نے بغیر کسی پس و پیش کے یہ جواب دیا:-

"جب قومی اور وطنی ذہنیت میرے اندر پختہ ہوگئی تو میں نے اپنی مادری زبان کو بے بسی کی حالت میں پایا۔ میرے ضمیر نے مجھ پر ملامت کی بوچھار کی کہ میں اپنی مادری زبان کو ترک کر کے دوسری زبان کی خدمت کر رہا ہوں۔ عہد ماضی کے تاریخی واقعات نے میری آنکھیں کھول دیں کہ آج کی پسماندہ کشمیری زبان نے صدیوں پہلے بڑے بڑے اہل کمال پیدا کئے تھے۔ مگر آج نہ صرف اس زبان سے غیروں کو بلکہ خود اہلِ کشمیر کو نفرت ہے۔ اور اسی کے بعد میں نے عہد کیا کہ اب میں اپنی مادری زبان کی خدمت کروں گا۔ اور پھر اسے دوبارہ زندۂ جاوید زبان بنا کر چھوڑوں گا۔ میں نے عہدِ رفتہ کے عوامی شاعر رسول میر اور حبہ خاتون کی طرز پر غزلیں کہنی شروع کیں۔ اور میں نے دیکھا کہ تھوڑے ہی دنوں میں میری یہ غزلیں زبان زد عام ہوگئی ہیں"۔)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مہجور اس دور کے کشمیری زبان کے سب سے بڑے عوامی شاعر تھے۔ دیوندر ستیارتھی نے ۱۹۳۴ء میں "ماڈرن ریویو" میں سب سے پہلے مہجور پر مضمون لکھ کر ہمیں ان سے متعارف کرایا تھا۔ اس کے بعد بلراج ساہنی نے ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء میں "وشوابھارتی" (انگریزی) میں ان پر دو مضمون لکھے جس میں انہوں نے مہجور کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ:-

" اگر مہجور آج ایک گیت کہتے ہیں تو وہ ایک پکھواڑے کے اندر اندر عوام کی زبان پر چڑھ جاتا ہے۔ بچے اسکول جاتے ہوئے، لڑکیاں دھان کاٹتے ہوئے، مانجھی ناؤ کھیتے ہوئے اور مزدور کام کرتے ہوئے ـــ سب کے سب اس گیت کو گانے لگتے ہیں۔ ایک غیر تعلیم یافتہ ملک میں جہاں مشہور شعراء کے مجموعے دس پانچ کی تعداد سے زیادہ نہیں بکتے، مہجور کی اس مقبولیت کو کرشمہ ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے"۔

مہجور کی اس قدر مقبولیت ہوتے ہوئے بھی کشمیر کے اعلیٰ طبقے نے ان کی شاعری کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ لیکن جب کشمیری تاریخ کے عالم اور میونسپل بورڈ کے سابق چیئرمین پنڈت آنند نارائن کول نے مہجور کے ایک ابتدائی گیت "اے میرے پھول" کا انگریزی ترجمہ کر کے "وشوابھارتی" میں شائع کروایا تو پڑھے لکھے طبقے میں ایک ہل چل مچ گئی۔ اس وقت شاعر اعظم ڈاکٹر ٹیگور زندہ تھے انہوں نے اس کی تعریف کرتے ہوئے مہجور کو لکھا کہ "میں نے آپ کی نظم دیکھی، آپ کے میرے خیالات ملتے جلتے ہیں۔ اگر آپ بنگالی اور انگریزی سے واقف ہوتے۔ تو میں کہتا کہ یہ خیال آپ نے میری نظموں سے حاصل کیا ہے۔ میں آپ کی نظم سے بہت خوش ہوں"۔ اسی طرح سے جب ان کی دوسری نظم "کسان لڑکی" کا ترجمہ ٹیگور نے پڑھا تو انہوں نے دوبارہ مہجور کو لکھا کہ "تم کشمیر کے ورڈس ورتھ ہو"۔ اس وقت کشمیر کا اعلیٰ طبقہ اپنی نیند سے چونک پڑا اور سری نگر میں منعقد ہونے والے ایک مشاعرے میں پہلی بار مہجور کو مدعو کیا گیا۔ وہاں پر اپنی نظم سنانے سے پہلے مہجور نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:-

"ٹیگور کی یہ عالیشان دوستی اور مردم شناسی ہے کہ

اُنہوں نے صرف ایک لفظ کہکر میرے وطن کے لوگوں کو میری موجودگی کا احساس دلایا"۔

مہجور کی شاعری کے متعلق کسی قطعی رائے کا اظہار کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔ اس لئے کہ ان کی نظموں کا اردو میں کوئی کامیاب ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ جب تک کامیاب ترجمہ نہ ہو یہ انتہائی مشکل ہے کہ ان کے متعلق کسی قطعی رائے کا اظہار کیا جائے۔ جہاں تک ان کی نظموں کے انگریزی تراجم کا تعلق ہے میں یہ کہنے کے موقف میں ہوں کہ ان میں نزاکتِ خیال اور باریکیٔ فن، تنوّع اور طرزِ بیان کی ندرت بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کی شاعری محبت اور وطن پرستی کی شاعری ہے۔ اپنی زندگی کے آخری دَور میں اُنہوں نے سیاسی نظمیں بھی کہنی شروع کی تھیں لیکن وہ اسی قدر مقبول نہیں ہو سکیں، جتنا کہ ان کی رومانی نظمیں مقبول ہوئی ہیں۔ میں ان کے اردو اور فارسی کلام کے چند نمونے پیش کر سکتا تھا۔ لیکن اُنہوں نے ایسا کرنے سے مجھے منع کر دیا تھا۔ اس لئے کہ وہ عہدِ رفتہ کی اس شاعری کو پسند نہیں کرتے تھے۔ بہرحال ان کے ہاں آزادی اور محبت کے جذبے کا ایک شدید احساس پایا جاتا ہے جس کی سماجی نقطۂ نظر سے بہت بڑی اہمیت ہے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصّہ کسانوں کے درمیان گذرا ہے اور اُنہوں نے بہت ہی قریب سے ان کی غربت، افلاس اور مجبوری کا گہرا مشاہدہ کیا تھا اور ان کا یہ مشاہدہ حقیقت پسندانہ اہمیت کا حامل ہے اس لئے کہ خود شاعر نے غربت اور تنگدستی کا برسوں مقابلہ کیا تھا۔ وہ اپنی شاعری میں قدرت کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ وہ کوئی خیالی چیز معلوم نہیں پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ جدید اردو و فارسی شاعری کے امتزاج سے خیالات کا ایک ایسا مقصدی محل تعمیر کرتے تھے کہ وہ عوام کی خوشحالی کا ضامن دکھائی دیتا ہے ــــ وہ ہمیشہ نیا باغ لگانے کی بات کرتے تھے جس میں بلبل کو تاجداری حاصل ہو، جہاں ایک ہی مذہب کی پیروی ہو، جہاں لوگ گُل لالہ پسند کرتے ہوں، بھنورا نرگس کے پھول پر منڈلاتا ہو، جہاں کوئل کی مدھری کوک سنائی دیتی ہو، جہاں عُلیل اندازوں نے گیدڑوں کو مار بھگایا ہو اور چیلیں گوشت کھانا چھوڑ کر پرہیزگار بن گئی ہوں۔ جہاں سورج کی کرنیں پہاڑوں کی سر بفلک چوٹیوں کو منور کرتی ہوں ــــ وہ آنیوالے کل کے کشمیر کو ایسا گلشن بنانے کے آرزومند تھے جہاں عوام بغیر کسی خوف و ہراس کے امن چین کی زندگی گذار سکے۔ "کسان لڑکی" میں شاعر اسے اس طرح مخاطب کرتا ہے :-

"اے حسین کسان لڑکی! تو چشموں کے کنارے سبزہ زار پر لگائی ہوئی تلسی کی طرح ہے۔

تو اپنے بوسیدہ کپڑوں میں بھی ایسی حسین دکھائی دیتی ہے، جیسے بادل کے ٹکڑوں کے درمیان سے ماہتاب نظر آتا ہے۔

تو جب نغمہ چھیڑتی ہے تو تیری مسحور کُن آواز سن کر پریاں بھی تعریف کرنے لگتی ہیں۔ تیرے حُسن میں بناوٹ اور تصنع نہیں ہے۔

جب تو باغیچوں کے درمیان سے گذرتی ہے تو کہیں پھولوں نے تیرے کان تو نہیں بھر دئے ہیں۔

خواجہ زادیاں تیرا کیا مقابلہ کریں گی، تو، تو پھولوں کے ساتھ اُٹھتی بیٹھتی ہے۔

خواجہ زادیاں، در اور دریچے بند کر کے پڑی رہتی ہیں۔ تیری مدھری آنکھیں شرم و حیا کے پانی سے لبریز ہیں۔

تجھ میں غیرت اور خود داری کی جلوہ آرائی ہے۔

پھر بھی پسینے سے نم تیری پلکیں، تلوار کی دھار کا کام دیتی ہیں، اور ہر دیکھنے والے کا دل موہ لیتی ہیں۔

مگر اے شرابِ ناز سے لبریز جام! دیکھ تیرے ہوش و حواس خراب نہ ہو جائیں۔ دوسروں کو دیکھ کر عیاشی اور کاہلی کی عادت پیدا نہ ہو جائے۔

اے حسین کسان لڑکی! میں نے تجھے کھیت کے ایک کونے میں کام کرتے دیکھا ہے۔

جہاں تو تھکن سے چُور ساتھیوں کو اپنے مسحور کن نغمے سنا کر کام کی جانب مائل کر رہی تھی۔ کہیں تو، تو نہیں تھک گئی ہے؟"

مہجور کی دوسری بہت ہی مقبول نظم "کشمیری عورت" ہے جس میں موجودہ کشمیری سماج اور خاص طور پر عورت کی گری ہوئی حالت کا ذکر کر کے اسکو ایک نئی دُنیا کا پیام دیا گیا ہے۔ اس نظم میں عورتوں کو ایسی خود اعتمادی کا احساس دلایا گیا ہے کہ آج کشمیر میں تہواروں کے موقع پر عورتیں ایک مذہبی گیت کے طور پر اس نظم کو گاتی ہیں۔

(مہجور کی شاعری میں نہ صرف ماضی کی عظمتِ پارینہ کا احساس سمویا

ہوا ہے بلکہ اس میں وطن کی محبت کے شعلے بھی لپکتے ہوئے نظر آتے ہیں کشمیری زبان کے کلاسیکی شعراء کی طرح مہجور بھی اپنے اہلِ وطن کو بہادروں کے کارنامے سناتا ہے۔ شاہانِ سلف میں وہ للتا دتیہ کا نام لیتا ہے، مشہور سورماؤں میں تارنی بٹ اور رجے بھان کے گُن گاتا ہے، مشہور شعراء میں وہ غنی کی مدح سرائی کرتا ہے۔ یہ تمام وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے مادرِ وطن کی جمال آرائی میں اپنا شاندار تاریخی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ وہ اپنے اہلِ وطن کو یگانگت اور اتحاد کے لئے للکارتا ہے۔ وہ ان کو انسانیت کا درس دیتا ہے۔ اور مذہبی اجارہ داروں کے خلاف اپنی آواز بلند کر کے ان کی ٹھیکیداری کے پرخچے اُڑاتے ہوئے کہتا ہے:-

"مہجور کو سنو! اس کے نغموں میں تمہیں سچائی کی بلندیوں کے راز ملیں گے!
سچا علم یا عقل کی پختگی مذہبی ٹھیکیداروں کی میراث نہیں ہے!"

آگے چل کر وہ کہتا ہے:-

"تمام اہلِ کشمیر ایک ہیں، اور یہی احساسِ یگانگت انسانیت کی معراج ہے!
میں نے ہندو اور مسلمان دونوں کو ایک ہی وجود کے آگے سربسجود دیکھا ہے!
اے ارضِ محبت! میں اس سے بڑھ کر تجھے کون پیغام دوں!"

وہ بار بار انسانی محبت اور مذہبی ہم آہنگی کا درس دیتا ہے:-

"تمہارے وطن کا کون دشمن ہے اور کون دوست؟
تم اہلِ کشمیر ایک ہو، اور تم ایک ہی رہو!
دودھ اور شکر کو پھر ایک بار مل جانا چاہئے!
اس کشتی کا لنگر ہندو ہے تو مسلم اس کا بادباں!
اور تم دونوں ہی اس کشتی کے کھیون ہار!"

مہجور کی شاعری میں مستقبل کا بھی ایک پیغام پنہاں ہے۔ اس کے اشعار میں صرف محبت اور رومانس کی باتیں ملتی ہوں۔ ایسا نہیں ہے، اور نہ ہی اس کا کلام مرغزاروں اور باغوں کا ایک تختہ ہے جو عشق فریبی میں مبتلا کر کے چھوڑ دے۔ اس کے اشعار بدلتے ہوئے سمئے کا گیت ہیں مناظرِ فطرت، کوہ و دمن صرف احساسِ حسن ہی نہیں پیدا کرتے بلکہ احساسِ عمل کی بھی دعوت دیتے ہیں:-

"اے باغبان! اُٹھ اور چمن میں پھر ایک بار بہار کر دے آ!
گلزاروں میں گلاب مہک اُٹھے، اور بلبل پھر محبت کے ترانے الاپنے لگے!
چمن کی فسردگی، شبنم کی اشک فشانی، اور گل کی چاک دامانی کا دور ختم ہوا!
ایک بار پھر گلوں کے چہروں پر مسکراہٹ کھیل جائے اور بلبل کے لب نغموں سے چہکنے لگیں!
فریاد و فغاں کا کوئی حاصل نہیں، تجھے کون آزادی عطا کرے گا!
تیری نجات کے ضامن تو خود تیرے بال و پر ہیں!
چمن میں ہزاروں پرندے ہیں، پر ہر ایک اپنی دھن میں مست!
اے قدرت، ان کے گیتوں کو ہم آہنگ کر کے ایک تڑپا دینے والے نغمے میں ڈھال دے!"

(اسی طرح سے مہجور کی نظموں میں نئے کشمیر کی آزادی و نجات کی جد و جہد کی تڑپ ملتی ہے۔ وہ اپنے مبتلائے الم اہلِ وطن کو ایک درخشاں مستقبل کی طمانیت بخشتا ہے۔ جس میں اس کا وطن آزاد ہوگا اور تمام اہلِ وطن الم و افلاس سے نجات پائیں گے:-)

"میری بنجر اور ویران زمین اب عرصہ دراز تک یوں ہی نہیں رہے گی!
ان پر ایک نئی دنیا جنم لینے والی ہے!
یہ صحرائی ریگ زار اب کشت و گل کا روپ دھار لیں گے!
ان زہریلے کانٹوں کی جگہ سرو، و صنوبر کی قطاریں کھڑی ہوں گی!
اس بید لرزاں کو صندل کی استقامت حاصل ہوگی!
ان پہاڑوں کے دامن لعل و گوہر سے پُر ہو جائیں گے!

یہ کوہستان سونا اُگلنے لگیں گے!
غوطہ زن کے ہاتھ "ڈل" کی تہ سے زمرد نکالیں گے اور
نہر "دولر" اسکی جھولی موتیوں سے بھر دے گی!"

مہجور اپنے وطن کو یقین و اعتماد کی دولت سے بھی مالا مال کرتا ہے:-

"نئی دُنیا پر جب نئے آفتاب کی کومل کرنیں نور برسائیں گی!
تو تیری پیشانی سب سے پہلے منور ہو گی!
اس کے بعد یہی کرنیں پُوری دُنیا کو اپنی آغوش میں سمیٹ
لیں گی!"

مہجور ملک کے نفع خور اور لیٹرے طبقے کو اس آنے والے وقت سے آگاہ کرتا ہے جبکہ مجبور و محکوم انسان ظلم و استبداد کے خلاف صف آرا ہوں گے اور اپنے آپ کو ڈہال لینے کی کوشش کریں:-

"تو دو چار دن اور موج اُڑا لے!
جلد ہی تجھے سیلابوں سے دوچار ہونا ہے!
تیرے ڈرائنگ روم میں ایک دعوت عام ہو گی!
کان کھول کر اس حقیقت کو سن، اور وقت کے ساز سے ہم آہنگ
ہونے کی کوشش کر!"

اور جب مسرت کا آفتاب طلوع ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے:-

سیاہی شب ہجراں کا زور ٹوٹ گیا
افق سے جھانک رہی ہے نگار صبح وصال
قدم قدم پہ ہیں لالے کی مشعلیں روشن
نظر نظر سے عیاں ہے سکون و صبر و قرار
چمن کا دامن صد رنگ ہے بہارِ نظر

روشِ روشِ پہ کھلے ہیں کنول محبت کے
سُنہرے سبز گل و لالہ کے بہانے سے
ہماری دید کو آئے گی وہ بہارِ خیال
مہک اُٹھی ہے جو بوئے وفا سے وادیٔ دل

مٹا چکے ہیں دلوں سے غبارِ جورِ خزاں
فسانۂ شب ہجراں بھی لوگ بھول گئے۔
کچھ اس طرح سے ہوئی ہے طلوعِ صُبحِ بہار

ان حوالوں کے بعد ہم مہجور کی زبان اور ان کے فن کے متعلق مختصراً یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ وُہ بحیثیت مجموعی ایک ترقی پسند شاعر تھے۔ کیونکہ جہاں اُنہوں نے اپنی قومی زبان اور اس کے ادب عالیہ کی تمام اچھی روایات سے استفادہ کیا ہے وہیں اُنہوں نے اس کا بھی پورا پورا خیال رکھا ہے کہ پُرانی شاعری کے ان تمام اثرات سے اپنے کو محفوظ رکھیں جو قوم کی بڑھتی ہوئی زندگی کے لئے رکاوٹ بن سکتے تھے۔ مواد اور فن کے سلسلے میں جہاں وُہ رسول میر اور حبہ خاتون وغیرہ کے گہرے اثرات قبول کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ وہیں پر ان کی رومانیت اور تصوف پرستی سے انحراف کا بھی مشورہ دیتے ہیں۔ کیونکہ رسول میر اور دوسرے کلاسیکی شاعروں کی طرح وُہ زندگی کو ایک سراب نہیں مانتے بلکہ فطرت کی طرف سے سونپی ہوئی ایک زندہ اور متحرک حقیقت سمجھتے ہیں۔ اسی لئے وُہ زندگی اور دُنیا سے پیار کرتے ہیں۔ اور اسے سنوارنے اور نکھارنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ زبان کے نقطہ نظر سے مہجور کی نمایاں خصوصیات دو ہیں۔ صوتی تاثر یا مترنم ہم آہنگی اور سلاست و سادگی۔ مہجور نے اور ورڈس ورتھ کے اس نظریہ کو اپنایا تھا کہ شاعر کو وہی زبان استعمال کرنی چاہئیے۔ جسے زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں یعنی نثر کی ٹکسالی زبان اور شعر کی مروّجہ زبان بالکل ایک نہیں ہو سکتیں۔ ان کی اسی اعتدال یا حقیقت پسندی نے انہیں کشمیر کا مقبول ترین شاعر بنایا تھا۔

چند سالوں پہلے نئے کشمیر کی تعمیر کے لئے جو لائحہ عمل مرتب کیا گیا تھا اس میں کشمیری زبان ہی کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا ہے۔ جس کے خواب مہجور تیس سال سے دیکھتے چلے آ رہے تھے۔ لیکن ابھی تک اس خواب کے تکمیل پانے میں کچھ مشکلات حائل ہیں۔ لیکن اب وُہ دن دُور نہیں ہے جبکہ مہجور کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو گا۔ جس کے پیچھے سینکڑوں سالوں کی تاریخ، تہذیب اور روایات موجود ہیں۔ اور انہیں روایات کو زندہ رکھنے کے لئے مہجور جیسے شاعروں نے انتھک کوششیں کی ہیں، کر رہے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔

امین کامل

مہجور کی شاعری اور شخصیت

مہجور پر جو کچھ میں لکھ رہا ہوں - چند غیر مربوط خیالات کو تسلسل سے بیان کرنے کی ایک سعی ہے۔ لیکن ان خیالات کی تہ میں ایسی کئی چیزیں مل سکتی ہیں، جن سے اُن کی شاعری اُن کے فن اور اُن کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

مہجور ہمارے پُرانے اور نئے ادب کی وہ درمیانی کڑی ہے کہ اگر اُسے علیحدہ کر دیا جائے تو ہم نہ صرف موجودہ ادبی دَور کا کوئی ہمہ گیر تجزیہ نہیں کر پائیں گے۔ اور اُس کا پس منظر سمجھنے میں ٹھوکر کھائیں گے بلکہ ان ادوار کے درمیان ایک ایسی خلیج پیدا ہو گی، جس کو کسی طرح پاٹا نہیں جا سکے گا۔ یہ بات اس امر کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے کہ مہجور کا ہماری شاعری میں کتنا اہم مقام ہے۔

مہجور نے اپنی شاعری کی ابتدا فارسی اشعار سے کی۔ لیکن فارسی اپنا صدیوں پرانا اقتدار کھو چکی تھی۔ اور اُس کی جگہ اُردو اور انگریزی لے رہی تھی۔ جس کا اظہار مہجور سے بہت پہلے فردوسیٔ کشمیر وہاب پرے کی زبان سے ہو چکا تھا۔

اڑ چھہ انگریزی تہ اُردو بیہ میانُن بند و بست
فارسی کلہ آلو تھۆوُن، یہ چھُو از دِیُن نۆ طریق
فارسی خواں در تاسف کیازِہ راوُر لوکہ چیار
او خوا سہ بیٹ بلِ اُتھ، یہ چھُو از وُن نۆ طریق

(نئے زمانے کی ستم ظریفی نے فارسی کا سر کچل کر اردو اور انگریزی کا جھنڈا بلند کیا۔ فارسی کے علماء کو افسوس صرف اس بات کا ہے کہ اُنہوں نے مکتبوں میں ملّاؤں کے پاس اپنی جوانی ضائع کر دی۔)

فارسی کی اس "کس نمے پُرسد" والی حالت کے پیشِ نظر مہجور نے اُردو کی طرف اپنی طبیعت کی باگ موڑ لی۔ لیکن اُن کی اُردو کی استعداد اتنی نہ تھی کہ وہ اس میں لغزشوں کے بغیر زیادہ دُور تک چل سکتے اور اپنے وقت کے اُردو شعراء کی صف میں، جن میں سے اکثر غیر ریاستی تھے کوئی نمایاں جگہ پا سکتے۔ لازماً اُنہیں اُردو کو بھی خیر باد کہہ کے اپنی مادری زبان کشمیری کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ یہ ۱۹۲۹ء کے قریب کا واقعہ ہے کشمیری زبان کی یہ راہ اپنے لئے متعین کرتے وقت ظاہر ہے کہ مہجور کو کسی دِقّت کا سامنا نہیں کرنا پڑا، زبان اپنی تھی۔ شاعری کا مادّہ فطری تھا۔ پھر جس اُستاد (علی گنائی عاشق، مصنّف گلزارِ حسن و زہرا بہرام) سے ابتدائی تعلیم پائی تھی۔ وہ خود کشمیری زبان کا مانا ہوا شاعر تھا، جس کے تلمذ میں اُنہیں کشمیری میں اکثر طبع آزمائی کے مواقع فراہم ہوئے تھے۔ پھر بھی ایک اہم سوال رہ جاتا تھا کہ وہ اپنے سے پہلے شعراء میں سے کس ایک کے رنگ کی تقلید کرے۔ وہ سوال جو ہر نئے شاعر کے لئے پہلے پہل دردِ سر بن جاتا ہے اور جس سے مفر کی کوئی راہ نہیں ملتی۔ اپنی طبیعت کے اقتضاء اور فارسی تغزل سے واقفیت کے طفیل مہجور نے رسول میر، حبہ خاتون اور کسی حد تک وہاب پرے کے رنگ کو اپنانے کا ارادہ کیا کیونکہ ان شعراء کی غزلیں مقبولیت کی وجہ سے ساری وادی میں گونج رہی تھیں۔ عوام نے اِنہیں اپنایا تھا۔ وہ ان غزلوں میں اپنے دل کی دھڑکنیں محسوس کرتے اور اپنے دُکھ درد کا تسکین پاتے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ متصوفانہ شاعری کے برعکس اسے اپنی روزمرہ زندگی کے زیادہ قریب اور ہم آہنگ پاتے تھے چنانچہ مہجور نے اپنی چند ابتدائی عشقیہ غزلیں انہی شعراء کی تقلید میں کہیں۔ لیکن سب سے زیادہ اثر رسول میر نے قبول کیا۔

ییتھ وردہ سوزس پردہ تلیتھ گو شوٗرسُل میر
مہجورَ لاگتھ آؤ بیہ دوٗبارہ اَتی روز !

(اس سازِ عشق کے چہرے سے رسُول میر نے غلاف اُٹھایا تھا، آج وہی مہجورؔ کے روُپ میں اس کو پھر سے چھیڑنے آیا ہے)

تقلید کی یہ حالت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی اور ان کا اپنا ایک انفرادی رنگ اُبھرنے لگا جس کو ہم آج "مہجورؔ کے رنگ" سے تعبیر کرتے ہیں جو ایک حسین امتزاج ہے۔ پرانی شعری روایات اور نئے شعری تقاضوں کا۔ اس میں لوچ بھی ہے رس بھی، خلوص بھی ہے، زندگی نوازی بھی، ادبی شان بھی اور عوام سے قربت کی چاشنی بھی۔ سب سے بڑی خوبی یہ کہ روایتی فارسی ترکیبات و تشبیہات سے گلوخلاصی اور اُتنے ہی گہرے خیالات جہاں تک ایک عام کشمیری کی پہنچ ہے۔ اس بات سے ان کے اشعار میں فکری پہلو کم ہے لیکن جذباتی اور محسوساتی کیفیت پُورے جوبن پر ہے۔

مہجورؔ نے صوفیوں کی زبان میں "مجازی" اور ہماری آپ کی زبان میں "عشقیہ شاعری" شروع کی اور عمر بھر اس کو ایسی فنکارانہ صفائی سے نبھاتے رہے کہ اس کی نظیر ہمارے سارے شعری سرمایہ میں رسول میر کے بغیر اور کہیں نظر نہیں آتی۔ لیکن ہماری شاعری پر تصوف کا جو صدیوں پرانا غلبہ چلا آ رہا تھا۔ اُس کے خلاف لڑنے کے باوجود مہجورؔ ذہنی طور پر اُس سے مرعوب بھی رہے۔ وُہ تضاد جو ہمارے معاشرہ میں شدت کے ساتھ موجود تھا (اب بھی ہے) اس چیز کا اظہار مختلف صورتوں میں اُنہی متصوفانہ شاعری کی مخصوص علامات، آہنگ اور روایات کے ساتھ، دبے دبے الفاظ ہی میں سہی۔ ان کے یہاں آخری وقت تک ہوتا رہا۔

چھینہ تعریف شرمس تہ سازس   ییہ مہجورَ لارک مجازس
بلکہ رادی ییہ مُولہ مائے   پایہ بڈہ میانہ یاوُن راےِ

(اے مہجورؔ تو ان کے حسن اور اُس کے بناؤ سنگار کی باتوں کو مجازی عشق سے تعبیر نہ کر۔ دیکھ تیری اپنی ہی سمجھ تیری ٹھوکر کا باعث نہ بن جائے)

یارَس قدمن دندہ زوٗ جانے   چھی دنان روزنہ وامانے لوٗ ز
تعبیر

پاک روز تس لنہ واتک پانے   بلبُل سنہِ افسانے بوز

("اپنے دوست پر اپنی جان نچھاور کر"۔ یہ وُہ آواز ہے جو کہ پازیب کی جھنکار سے آتی ہے۔ اگر تو اپنے من کو پاک و صاف رکھے گا تو ضرور اُس کے حضور باریابی پائے گا)

ہا منوشہ پوش چھکُ ژہ توشان   پیدہ کر پن نئے بارغچ زان

(اے مُور کھ تو پھولوں کا دیوانہ کیا بنا بیٹھا ہے، ذرا اپنے من کے باغ کو پہچاننے کی کوشش کر)

یہ ساری نظم اسی رنگ میں ہے۔ اس ذہنی تضاد ہی کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف مہجورؔ طبقاتی سماج میں مذہب کے کردار کو "تنتہ تر چھا مسکین مرتد تہ بے دین، دین دار دُنیا دار" (دولتمند دنیادار اور غریب بے دین مانے جاتے ہیں) کے رنگ میں دیکھتے تھے۔ تو دوسری جانب سے طبقاتی جد و جہد اور استحصال کی موجودگی کو مذہب سے دُور جا پڑنے کا نتیجہ ٹھہراتے تھے۔

دھرم تے مذہب ایمانداری   ییتھ کالہ اوس ییتہ جاری لے
تتھ بدل از چھ ییتہ زوراداری   کاژہ زدٗن لو زمیانِ زاری تے

(گئے زمانے میں یہاں دھرم اور مذہب کا بول بالا تھا، اب اس کے بجائے باہمی آویزش اور بالادستی زوروں پر ہے)

لیکن زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں نے ان کی اس "ذہنی مرعوبیت" کو کبھی نمایاں طور پر اُبھرنے کی اجازت نہ دی۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ مرحوم عبدالاحد آزادؔ کا انقلابی وجود مہجورؔ کو اس طرف جھکنے میں ایک بہت بڑی روک ثابت ہوا۔ چنانچہ جب مہجورؔ نے از راہِ عقیدت "چھر پورہ" کی زیارت شریف پر ایک نظم کہی تو آزادؔ نے اُسی ردیف و قوافی میں اُن پر طنز کی۔ جو کہ زبان زد عوام ہے۔

باوصف اس کے مہجورؔ مذہب کے مخالف نہیں تھے۔ وہ رُوحانیت، تصوف، تقدیر، غرضیکہ ہر ایسی چیز کے قائل تھے جو کہ عینی فلسفہ سے تعلق رکھتا ہے۔ البتہ کھوکھلی رُوحانیت، بے جان تصوف اور نام نہاد مذہب کی آمریت کے کٹر مخالف تھے اور اُس کے خلاف ہمیشہ آواز اُٹھاتے رہے۔

کینہہ خام طمع رام کرُم کھنڈہ فلیوٗسیت

ہاوٗتِ خُداکینہہ سادہ • دِل دِلوانہ سَناوٗم
مہجوٗرہ سنزہ کتھہ بوٗز لیکھہ معرفتک سپٲۓ
پوٗز گیان تہٕ عرفان چھوٗنہ گوٗرن تہٕ ملن منز

(کئی عقل کے اندھے میں نے تعویذ گنڈوں سے اپنے مطیع کر لئے اور کئی ضعیف الاعتقاد خُدا کے نام پر بیوقوف بنا کر رکھ دیئے۔ مہجور کی باتوں میں تجھے حقیقی معرفت کا سُراغ ملے گا۔ مُلّاؤں اور پنڈتوں کے یہاں نہ تو سچّا عرفان ہے اور نہ سچّا گیان)

ہندوستان میں برطانوی سامراج کے خلاف ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد قومی تحریک نہایت ہی شدومد سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کا لازمی اثر ہماری ریاست پر بھی پڑا، اور ۱۹۳۱ء میں یہاں بھی باقاعدہ شخصی حکومت کے خلاف جو کہ برطانوی سامراج کی پروردہ تھی، تحریک چلی۔ اس تحریک کا بلاواسطہ اثر مہجور کی عشقیہ شاعری پر بھی پڑا۔ بلاواسطہ اس لئے کہ مہجور نے اس تحریک کی ابتدائی منزلوں میں اس کی ترجمانی تو نہ کی (بلکہ قدرے تشویش وتشکیک سے دیکھتے رہے) لیکن ان کے عشقیہ خیالات میں بےلبسی اور نسائیت کی بجائے رجائیت کے عناصر سرایت کرنے لگے۔ جوں جوں یہ تحریک شہروں سے دیہات کی طرف قدم بڑھانے لگی اور عوام اس سے منسلک ہو کر منظم ہونے لگے، ہماری شاعری بھی اس کی براہِ راست ہمنوائی کرنے پر مجبور ہوئی چنانچہ مرحوم آزاد اس میدان کے پہلے مجاہد تھے۔ اُن کی آواز تھی:-

سب سے پہلے مضموں پر لکھنا

کلہنؔ، غنیؔ تہٕ صرفیؔ سیراب کرٕ یم آبن
سوٗی آب سانہ باپتھ زہرِ ہلال آسیا

(کلہن، غنی، اور صرفی جس پانی سے سیراب ہوتے رہے کیا وہ پانی ہمارے لئے زہر ہلال بنا دیا جائے گا، (کبھی نہیں)

گہری نظر سے دیکھا جائے تو آزاد کی شاعری سے اُس دور کی شعوری اور باضابطہ بنیاد پڑتی ہے۔ جس کو ہم "موجودہ ادبی دور" کا نام دیتے ہیں۔ آزاد یوں تو مہجور کا شاگرد تھا لیکن شعوری سطح میں اُن سے بہت ہی بلند تھا۔ وہ طبقاتی سماج اور اُس کے گھناونے نتائج سے بخوبی واقف تھا۔ وہ کشمیر کے مفلوک الحال عوام کو اُس منزل کی طرف لے جانے کے لئے بےقرار تھا جو کہ اُنہیں لوٹ کھسوٹ سے آزاد کر کے اُن کے ہاتھوں میں اقتدار کی باگ تھما دے لیکن اُس کی ایک بڑی خامی یہ رہی کہ اُس نے اپنے عوام کی شعوری سطح کا بالغور مطالعہ نہیں کیا جس سے وہ پُرانی قدروں کے صریح انکار پر اُتر آیا۔ وہ مذہب اور خُدا سے شدید طور پر اُلجھ گیا جو کہ اُس کی انتہاپسندی تھی۔ اس کے باوجود اُس کا مقام بہت ہی بلند اور اُس کی شاعری سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

قومی تحریک کے بڑھتے ہوئے تقاضوں اور آزاد کے نئے انقلابی خیالات نے مہجور کو بھی متاثر کئے بغیر نہیں چھوڑا۔ اور وہ بھی عوامی جدوجہد کا ساتھ دینے لگے۔ لیکن ان کی آواز میں آزاد کی انتہاپسندی نہ تھی البتہ ہماری قومی تحریک میں جو حدبندیاں تھیں وہ ان کی شاعری کا بھی احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ مہجور کے سامنے ایک پس ماندہ جاگیرداری سماج تھا اُس کا واسطہ دیہاتی ہونے کی وجہ سے اور اپنے پیشے (پٹواری) کے لحاظ سے بھی کسانوں سے رہا اور اُن ہی کے سلسلے میں طبقاتی سماج پر نظر ڈالی۔ اُنھوں نے اشتراکی فلسفے کا کوئی سنجیدہ مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اور نہ وہ اس کے قائل تھے وہ طبقات کے خاتمے سے حاصل ہونے والے فوائد پر صحیح طور پر نظر نہ ڈال سکے۔ اُن کی آواز انقلاب پر کم اور سمجھوتے پر زیادہ زور ڈالتی تھی۔ بالکل وہی چیز جو ہماری قومی تحریک کی حدبندی تھی یہ ایک بڑی وجہ ہے کہ ان کی سیاسی شاعری میں کسی واضح نصب العین کا سراغ نہیں ملتا۔ مہجور کی ان سیاسی نظموں کے اثر سے اُن کی غزل بھی جو کہ پہلے محض عشقیہ ہوا کرتی تھی، نہ بچ سکی اور اب وہ سیاسی اور عشقیہ خیالات کی آمیزش بن گئی۔ لیکن اس سے اُن کے عشقیہ اشعار کا حسن اور تاثر کم نہیں ہوا۔

پاسبہ چمن، گُل چھہ توٗرے کنڈٕ چھہ تمبس لارِ
آزاد بُلبُل باشہ کرانٕ پوٗشہ ڈلن منز
وُلو رپوشن کم تلان چھاوان چھہ کم باغک بہار
بے خبر آمہ رازہ نِشہ چھک شوروشر بسیار چھہ ی

(چمن کی غلامی کے باعث گلاب کے پاؤں میں کانٹوں کی زنجیر

پڑگئی لیکن بُلبُل اپنی آزادی کو عزیز رکھنے کے باعث مرغزاروں میں مزے اُڑاتی رہتی ہے۔ زرِگُل کون اُڑا کے لے جاتے ہیں؟ باغ کی بہاروں سے کون لُطف اندوز ہوتے ہیں؟ اس بھید کو سمجھنے کے بغیر تیرا سب جوش و خروش کس کام کا۔)

ان کی غزل کا یہ نیا رنگ موجودہ غزل کی بُنیاد بن گیا جس میں استعارات و رمز و کنایات تو یہی کچھ ہیں۔ لیکن خیالات زیادہ نازک اور فکری پہلو زیادہ نمایاں ہونے لگا۔ اس بات کو موجودہ غزل کی عوام سے دُوری نہیں کہا جا سکتا، بلکہ زبان کی وُسعت وقت کے نئے ادبی تقاضوں، عوام کی بڑھتی ہوئی شعوری سطح اور خود شعراء کے عمیق مطالعہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

مہجور کی شاعری نے یہاں کی قومی بیداری میں جو حصہ لیا، اُس نے ایک طرف تو ہمارے عوام کو جذبات اور احساسات کے لحاظ سے اُس عمل کے لئے تیار کرنے میں مدد دی، جس کا سیاسی میدان سے اُن سے مطالبہ ہوتا تھا۔ دوسری جانب سے کشمیری زبان کو وُسعت ترقی اور جِلا بخشی جس سے ہم پر ادب کے دروازے کھُل گئے جنہیں شخصی نظام نے ہم پر بند کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔

عوام کے احساسات و جذبات کو اُبھارنے کے سلسلے میں مہجور نے وقت وقت پر جو رول ادا کیا، وُہ تفصیل طلب ہے۔ البتہ ذیل کے چند اشعار اُن تمام نازک سیاسی مراحل کی یاد دلاتے ہیں۔ جن سے ہماری آزادی کے قافلے کو گذرنا پڑا۔ ان میں حبّ وطن کے ابتدائی جذبے "کشمیر چھوڑ دو" کے تاریخی نعرے، ۱۹۴۷ء کے ایّام میں فرقہ دارانہ اتحاد برقرار رکھنے کے آدرش، کشمیر پر قبائلی حملے، اور ایک نئے کشمیر کے پُرامید خواب تک کے تمام مرحلے شامل ہیں۔

ولو ہا باغبانو نو بہارُک شان پیدا کر
پھولن گُل گتھ کرن بُلبُل تتھی سامان پیدا کر
اگر وُزہ ناو مِن لبستی گُلن ہنز تراو زیر و بم
بُونیول کر، داو کر، گگرایہ کر، طوفان پیدا کر

(اے باغبان اُٹھ اور ایک نئی بہار کی بُنیادیں استوار کر۔ ایسے سامان بنا کر پھُول کھِل اُٹھیں، اور بُلبُل گیت گائیں۔ اگر تجھے پھولوں کی بستی کو جگانا ہے تو طاؤس و رباب کو خیرباد کہہ کے طوفان، گونج گرج اور بھونچال کے مانند اُٹھ اور آگے بڑھ۔)

دوھہ تارہ ژھوہ مار ساز و سامانس
بُتھہ پتھے کائم طوفانس سیئت
گُلھ بُتھن چیاٗ اُمس اتھ دِوان خانس
پئے بوز لئے تھوَ زمانس سیئت

(اپنی یہ رنگ رلیاں اور کچھ دن اور منا۔ جلدی ہی طوفان آنے والا ہے۔ تیرے ان بلند ایوانوں میں عوام اقتدار کا رقص کریں گے۔ میری بات سُن اور وقت کا ساتھ دے۔)

نیائے تراُوِو مائے تھاوِو پانہ وأنِ
پوز محبت باگرِ اوِو پانہ وأنِ
صاف تھاوِو سینہ مشراُوِو فساد
کینہ تراُوِو، داغ باوِو پانہ وأنِ
ہیٚند رٹِن نَم، کھوٚر وایَن اہلِ دین
ناو یمہ مُلکُچ چلاوِو پانہ وأنِ

(اپنے دل صاف کر کے تمام کدُورتیں دھو ڈالو، محبت کرو، ہاں ایک دوسرے سے سچی محبت کرو۔ آپس کے دُکھ درد میں شریک اور ہمدرد بن جاؤ۔ اس مُلک کی کشتی کو کنارے لگانے کیلئے مسلمان پتوار تھامیں اور ہندو کشتی کا سرا۔)

مُلکہ منزہ کڈ نک یِم واہ گیر اَسہ کیو تھ تِ چھُو جان
اُسی سنبھالو گھر پننٕ یِم نیرتن سارِی نیبر
غیرتس سائِنس کرو توٗہ کوٚت کالاہ امتحان
اُسِ مَرو، غیرَس کھوٚرن تَل زنہہ نہ نمراوو نہ سَر

(ہم چاہتے ہیں کہ اس سرزمین سے یہ سارے باہر نکل جائیں۔ تاکہ ہم خود اپنا گھر سنبھالیں۔ ہماری غیرت کو یہ لوگ کب تک امتحان کرتے رہیں گے۔ ہم مرنا قبول کریں گے لیکن کسی کے سامنے اطاعت کی گردن جھکانے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔)

کشمیری زبان کو مہجور نے جو وُسعت بخشی اُس کے متعلق

اس سے بڑھکر ادب کیا کہا جا سکتا ہے۔ کہ وُہ زبان جو کہ فارسی الفاظ و تراکیب کی بھرمار سے بعید از کار تشبیہات و استعارات اور متصوفانہ خیالات کے ابہام سے نہایت ہی پُرتکلف بن گئی تھی، ان کے فن کارانہ ہاتھوں سے فصاحت و سلاست کی اس معراج تک پہنچ گئی۔ (شعروں کا ترجمہ مقصود نہیں)

ژلہ لارہ وُچھمکھ حال وَنہے وارہ وُچھے زَوئے
گلہ زیُومہ گیم اُدش وَتھم دَد رایہ وَنے کیا
لوَہ ہنز تہ چھندریمز مسول ونان چھ واوس
دامانہ میوں یُم چھول تس زاہنہ قرار آسیا
پختہ کارن محنتہ گُھرے بیٹھہ وُچھم آمُت قرار
یِہے چیز اَسہ غلامن اَمس ظالم زورہ ٹلہ یاون
کنہ اُن تی بازرن اندر کرتھ مُولہ مایہ آزادی

ہر شاعر اور ادیب کا جسطرح اپنا ایک اسلوب ہوتا ہے۔ اُسی طرح کسی چیز پر نظر ڈالنے اور اُسے بیان کرنے کا انداز بھی مخصوص ہوا کرتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جہاں وُہ ایک خاص رنگ میں کھلتا ہے۔ دوسرے میں اپنے امتیازی شان کے ساتھ نہیں اُبھرتا۔ مہجور کو فطری طور پر تغزل کا رنگ عطا ہوا تھا اس لئے اُن کا وُہ کلام جو تغزل محض ہے زیادہ سوز و گداز سے لبریز ہے بہ نسبت اُس کلام کے جس میں سیاسیات و معاشرہ سے متعلق پیغامات ہیں۔ ان کی سیاسی نظموں میں وُہ تڑپ اور خون کو گرمانے والی انقلابی رُوح نہیں ملتی جو کہ آزاد کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی سیاسی نظمیں بھی وہی کامیاب ہیں جن کا اسلوب اور اندازِ بیان تغزل کا ہے یا رمزیہ انداز میں ہیں، (مثال کے طور "گل لالہ سے خطاب" یا "شکر مالائیں جگمگا اُٹھیں")۔

جہاں تک مہجور کی شخصیت کا تعلق ہے وُہ اسقدر طاقتور تھی کہ آزاد جیسے انقلابی اور فکری شاعر کو اُن کے جیتے جی، بلکہ ابھی تک اپنے پورے خدوخال کے ساتھ اُبھرنے کا موقعہ نہ ملا۔ مہجور کے ساتھ میرے تعلقات ۱۹۴۷ء کے بعد شاید سب سے زیادہ رہے اُن کے سامنے مجھ ایسا انسان ایسا لگتا گویا ایک بہت بڑے مردِ درویش کے سامنے ایک بے بضاعت آدمی شرفِ قدمبوسی حاصل کرنے آیا ہو۔ اب تو ایسی کوئی شخصیت باقی نہ رہی۔ صرف شاعر اور ادیب رہ گئے خواہ وُہ آپ ہوں یا ہیں۔

ایک دن مہجور میرے پاس آئے۔ میں نے اُن کا تعارف اپنے ایک سادہ لوح لیکن صوفی منش دیہاتی مہمان سے کرایا۔ میرے اس مہمان کو نہ جانے یہ وہم کیسے ہوا تھا کہ مہجور "پہنچا ہوا مردِ درویش" ہے۔ اُس نے مہجور سے کوئی تعویز عنایت کرنے کی استدعا کی۔ مہجور نے بڑی سنجیدگی سے قلم کاغذ مانگا۔ میں بھی خاموش کہ دیکھیں کیا لکھ دیتے ہیں۔ مہجور نے کاغذ پر دس خانوں میں اس شعر کے الفاظ بانٹ کر لکھدئے اور بالکل تعویز کی طرح تہ کر کے اُس کو "عنایت فرمایا"۔

تتہ تہ چھا مہجور تنہا بہت دُور کو کرن چھکا محنتہ ہار

(کیا وہاں بھی مہجور ایسا شاعر تن تنہا بیٹھ کر، اندھوں کو بسنت کی بہار سمجھا رہا ہے)

اپنی وفات سے چند دن پہلے مجھ سے ملنے آئے۔ کافی تلاش کے بعد جب مجھے ملے تو غمِ دوراں کی کچھ باتیں کر کے بے اختیار رونے لگے۔ میں حیران کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ کہنے لگے "بھئی ایسا کچھ محسوس ہو رہا ہے کہ اُدھر کا بلاوا ہو چکا۔ افسوس اسبات کا ہے کہ خالی ہاتھ ہوں، کچھ اُدھر کا توشہ جمع نہیں کیا"۔ اس پر مسکرائے اور اپنے یہ شعر گنگنانے لگے۔

تیز پک پک کیا حاصل آم
منزلس واتنے سیدُم شام
چکہ جاۓ سورم لو کہ جار کتوُی گوم
بالئے آدنگ یار کتوُی گوم
ترادہِ یِلہ مہجور بارغ چھاوُن
اَدہ وَنہ آرہ وَل مسولہ کُن
راز دار تاز بردار کتوُی گوم
بالئے آدنگ یار کتوُی گوم

(میری یہ ساری تیز گامی اکارت ہو کر رہ گئی، منزل پر

تعمیر

پونچنے سے پہلے ہی شام سر پر آئی۔ میرا حوصلہ لوٹ گیا، آہ میری جوانی رخصت ہوئی۔ اے سہیلی، میرا پیا کہاں گیا۔ جس دن مہجور باغ سے رخصت ہوگا۔ گُل لالہ، بنفشہ کے پھول سے کہے گا، آہ وہ ہمارا ہمراز و غمخوار دوست کہاں گیا۔ اے سہیلی میرا پیا کہاں گیا) آخری شعر پر میری آنکھ میں بھی آنسو اُمڈ آئے۔ کیونکہ سماں ہی ایسا بندھا تھا۔

ایک دن میں نے اُن سے ان اشعار کی تشریح پوچھی۔
(ترجمہ مقصود نہیں)

دل مہجور تے چشمِ مخمور
نزدیک آستھ واراہ دُور
چشمو چھنون دلبر میون
"لو نو یارہ ذرہ یو دُور ریز چیون"

پہلے تو مسکرائے پھر کہنے لگے "آپ خواجہ سیف الدین گنائی (موجودہ ڈی، آے، جی پولیس) کو تو جانتے ہی ہیں۔ وہ چوری چھپے شعر بھی کہا کرتے تھے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے مہجور صاحب مصرعہ ہوا ہے۔ اس پر غزل کہہ دیجئے چنانچہ اُنہوں نے ٹیپ کا یہ مصرعہ کہا اور ہم نے اُس پر اُنہی کے یہاں یہ غزل لکھدی۔ خواجہ صاحب مخمور تخلص کرتے تھے۔ اب آپ شعر کی خود ہی تشریح کیجئے۔"

اس طرح میں نے اس شعر کی طرف توجہ دلا کر کہا کہ آپ کی بلبل عمر بھر نغمے الاپنے کے بعد بڑھاپے میں لیکچر بازی پر کیوں اُتر آئی۔ "دلو ہا پوشہ نولو پوشہ تھرو پیٹھ تازہ لیکچر کر۔" (اے بلبل اُٹھ اور پھولوں کی ٹہنی پر تازہ لیکچر فرما کر) کہنے لگے "اس لئے کہ زمانہ لیکچر بازی پر اُتر آیا ہے۔ پھر بھی شکر کیجئے ابھی تک شعری پابندی کے ساتھ لیکچر دیتی ہے، آپ لوگوں کی طرح "آزاد بحر" میں نہیں اُڑاتی۔" ان کی یہ چوٹ Free verse شاعری پر تھی جس کے وہ خلاف تھے۔

۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو سنٹرل جیل سرینگر میں عوام کے ہجوم پر گولی چلی۔ حکومت نے عوامی مطالبہ پر اس واقعہ پر کمیشن بٹھایا جس کے صدر چیف جسٹس سر دلال برجور تھے

اُس نے انتہائی چالاکی سے حکومت کو بچا کر عوام ہی کو مجرم بنایا۔ مہجور نے ایک قطعہ اُن کو لکھ بھیجا، لیکن اپنا صحیح نام لکھنے کے بجائے "ابجد" کے حساب سے مہجور کے جتنے سنہ سے بنتے ہیں۔ (۲۵۴) اُسی کے مطابق رند نام لکھدیا۔ قطعہ یہ تھا:-

شنیدم در جوانی بود عادل مرد آتش خو
بہ پیری جانب کشمیر اندر دورِ ما آمد
دلیل فتنۂ زنداں اگر خوانی تو می گوئی
نہ بر انصاف سر دلال کو برجور آمد

واقعات تو بہت ہیں کہاں تک لکھتے جائیے۔ بہتر ہے کہ ان غیر مربوط خیالات کے سلسلے کو اُوپر کے ان اشعار پر ختم کیا جائے۔

تراوہ یلہ مہجور باغ چھاوُن
اَدہ وَنہ آرہ دَل مسولہ کُن
راز دار ناز بردار کتُوی گوم
بالئے آدنگ یار کتُوی گوم

دینا ناتھ نادم (مرثیہ کے چند شعر)

گوُنہ ماتس موتک شر کرہ کیاہ؟
شیچھ گیہ شامن گامہ شہازی
باغن تہ جنگلن پھیر ژوپاری
گلہ وُون واوس داوُن لالس لالن پیالس پیالِ کلہ واس
کلہ والن پھیرمے خانس منز
مے خانس منز و ژھ ہوُل ہائے
بالس تہ بالس رژ مُھٹہ رائے
نون گو آلو ___ مہجور کوُت گو، مہجور کوُت گو!
پوُت پھیرِتھ آؤ آلو واپس
یِت چھوُی ___ کوُت گو؟
مہجور زندہ چھوُی۔ زندگی مرہ کیاہ؟
گوُنہ ماتس موتک شر کرہ کیاہ؟

غلام محمد مشتاق

نذرِ مہجور

"لاله میون منز شاله مارن سیت یارن آسه ما	میرا محبوب کہیں "شالہ مارؤں" میں اپنے دوستوں کے ساتھ گلگشت تو نہیں۔
سنبه لاوان بے شمارن بے قرارن آسه ما"	اور وہ کہیں اپنے لاتعداد بیقراروں کو سنبھالا تو نہیں دے رہا۔
حُسنکی تمُ پادشاہن مسوٗلن دل کرِوٗ بائل	اُس بادشاہِ حُسن نے دُنیا بھر کے محبوبوں کے دل موہ لئے ہیں۔
روٗشه کران شانه زُلفِ پیچ دارن آسه ما	وہ کہیں چھُپا چوری اپنی زُلفوں میں شانہ تو نہیں کر رہا۔
ڈل دہس بیٹھِ باله یارس وُچھنه آمُت عالماه	ڈل کے کنارے اُن کے درشنوں کو ایک کائنات جمع ہوئی ہے۔
تِکه تارس نته گِندان دِله کِنِ قرارن آسه ما	کہیں وہ دل کے قراروں سے تکی کھیل تو نہیں رہا ہے۔
یاوٗنک رنگ فیوٗر رُخسارن دِلن زُلمت ملال	اُدھر اُس کے رخساروں پر شباب کا رنگ اُبھر آیا ہے۔ اور ادھر دلوں سے گردِ ملال دُھل گیا
نوٗ فلئے لُجُمِژ امارن لوکه چارن آسه ما	یہ کہیں یوں تو نہیں کہ ارمانوں کے بالے بن میں شگوفے پھوٹ رہے ہیں۔
یوٗش کھتمت گیُت گنگائے ته اِشبرناگسی	گیت گنگا کے نالے اور الیشہ بر چشمے میں آج رونق ہے۔
پوٗشه هنُت سُند روشه درشن آب شارن آسه ما	میرے محبوب کا درشن آج کہیں آبشاروں میں منعکس تو نہیں۔
از چھوٗ پرتھ مجلسه اندر مہجوٗر سُند یاوٗن نشران	آج ہر محفل میں مہجور مرحوم کا جوشِ شباب موج زن ہے۔
از توٗے تسکین دِلن مشتاق یارن آسه ما	مشتاق! شاید اسی لئے دوستوں کے دلوں کو ایک سکون سا حاصل ہے۔

اپریل سنہ ۱۹۵۷ء

محمد یوسف ٹینگ

کلامِ مہجور ــــــ کشمیری ادب کے تاریخی پس منظر میں

مہجور کا ایک مقطع ہے ؎ مہجور شُلہ کوہ آکھ زراہ زیر یزہ ہے یور
دلیہ ژہ تہ یہنے کو نگہ پوشِک پاٹھ خریدار

(مہجور! تو سویرے ہی یہاں کیوں آگیا۔ ذرا دیر کے بعد آتے تو تجھے زعفران کے پھول کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا)

ایسی بہت سی شاعرانہ تعلیاں ہمارے ادب میں بے تکلفی سے رائج ہیں مگر مہجور کی تعلی کو سُن کر اُردو کے شہرۂ آفاق شاعر مرزا غالب کے مصرعے "میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں" کی یاد آتی ہے۔ مگر ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ جہاں غالب کے دعوےٰ کو تاریخ نے حرف بحرف درست ثابت کر دیا ہے۔ مہجور کا کہنا بالکل خلافِ واقعہ ہے۔ مرزا غالب کے سر پر بقائے دوام کا جو تاج زمانے نے رکھ دیا ہے۔ اُس سے قطع نظر بھی غالب کے اُس زمانے کے حالات سے آشکارا ہوتا ہے کہ جس ناقدری سے اُنکا پالا پڑا تھا، اُس کی صدائے بازگشت میں اُنکا یہ کہنا حق بجانب ہے۔ مگر حیرت کا مقام یہ ہے کہ جب مہجور اپنی مقبولیت اور شہرت کی معراج پر تھے۔ تو وُہ یہ شعر کیسے کہہ سکے۔ حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وُہ اُن معدودے چند خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں، جنہیں اپنا اصل مقام اور صحیح وقت میسر آتا ہے۔ اور جن کے اپنے زمانے کی سیاسی، معاشی اور مجلسی زندگی کے مختلف دھارے اُن کی شاعری سے متصادم ہونے کی بجائے اس کے حلیف ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح سے وُہ مثالی مقبولیت وجود میں آتی ہے۔ جو مہجور کی صف کے بہت کم شاعروں کو جیتے جی نصیب ہو سکی ہے۔ اس تعلی کا دوسرا دعویٰ زیادہ افسوسناک ہے۔ کیونکہ یہ امر باعث تاسف سہی مگر حقیقت ضرور ہے کہ مہجور کی یہ تفہیم کہ اپنے وقت کے بعد اُن کے کلام قدر و منزلت میں اِضافہ ہو جائے گا۔ درست ثابت نہیں ہوئی ہے اور زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ جوں جوں ہمارا ادب بلندیوں کی طرف جا رہا ہے۔ اور عوام کا شعور ترقی پذیر ہو رہا ہے۔ مہجور کی مقبولیت اور محبوبیت کم ہوتی جا رہی ہے اور اُن کا کلام دل کے نہاں خانوں سے تاریخ کی الماریوں کا رُخ اختیار کر رہا ہے۔

مہجور کی غیر مقبولیت ایک شاعر کے ذاتی سانحے کی حیثیت سے ہمارے لئے بہت کم توجہ طلب ہو سکتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ چند ایسے بنیادی سوالات وابستہ ہیں۔ جو کشمیری ادب و اِنشا کے کسی بھی سنجیدہ طالب علم کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ اور اُن میں سے سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ مہجور کی مقبولیت اور غیر مقبولیت کے اس ڈراما کے درمیان اُن کے کلام کا غیر متعصبانہ اور بے لاگ تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ اور اُن عناصر کا تعین کیا جائے جو مہجور کے قابلِ فخر ورثے کے طور ہمارے آئندہ ادب کی ترویج کے لئے قابلِ استعمال قرار دئے جا سکیں اور اُس کے ساتھ ہی اُن کی شاعری کے کمزور پہلوؤں کو الگ کر دیا جائے۔ اگر کسی معمولی شاعر کا سوال ہوتا تو یہ بات زیادہ اہم قرار نہیں دی جا سکتی تھی۔ مگر مہجور کی بات الگ ہے کیونکہ وجوہات خواہ کچھ بھی رہے ہوں۔ یہ ایک اٹل تاریخی حقیقت ہے کہ وُہ ہماری تاریخ کے ایک عہد آفرین زمانے میں ایک چوتھائی صدی تک ہمارے شعر و ادب پر چھائے رہے اور اب جبکہ اُن کی مقبولیت کے آفتاب کی خیرہ کُن چکاچوند اس حد تک کم ہو گئی ہے۔ کہ ہم ٹھنڈے دل و دماغ سے اس بات پر فکر کریں کہ مہجور کی انفرادی شاعری حیثیت کو الگ چھوڑ کر ہمیں اُن کے ورثے کے کن

پہلوؤں کو اپنی صحت مند ادبی روایات کے ارتقاء کی کڑی قرار دینا چاہیئے۔ اور اُس کے ساتھ اس کے کن غیر صحت مند عناصر کو جرأت کے ساتھ ترک کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ مہجور کے قامت (Statues) کے شعراء کے بعد جب کہ اُن کی تقلید ایک متعدی مرض کی طرح پھیلتی ہے۔ زبان و بیان کا یہ مرحلہ بہت نازک بن جاتا ہے۔ کشمیری ادب کی صحت مند بنیادیں استوار کرنے کے لئے یہ سوال خاص اہمیت رکھتا ہے کہ ہم مہجور کے بہترین اجزاء کو اپنے ادب کی رگوں کا لہو بناتے ہوئے بھی اُن کے کمزور پہلوؤں کی آبیاری کے رُجحانات کی بیخ کُنی کریں۔

مہجور کے مقابلتاً ضخیم دیوان کا مطالعہ کرنے کے بعد اُن کے یہاں تین مختلف رُجحانات کی ایک عجیب تثلیث کا احساس ہوتا ہے اُس میں تو دو رنگ اُن سے پہلے کی کشمیری شاعری کی روایات رہے ہیں۔ ایک رنگ وُہ ہے جب ہلکی پھلکی بحروں میں عام لوگوں کے وقتی جذبات کی جو شیک اور کبھی کبھی سطحی ہوتے ہیں، کی ترجمانی کی جائے۔ دوسرا رنگ وُہ ہے جب عشق و حسن کے راگ ذرا بلند سطح پر فنی نزاکتوں اور جذبات کے زیادہ ٹھہراؤ کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں، اور تیسرا رنگ سیاسی شاعری کا ہے۔ جس کے تعارف کا تاریخی سہرا خود اُن کے سر ہے۔ تیسرا رنگ چونکہ اُنہی سے شروع ہوا۔ لہٰذا اسکو صرف کیفیاتی طور پر کہا جا سکتا ہے۔ مگر پہلے دو رنگوں پر کوئی رائے قایم کرنے سے پہلے کشمیری شاعری میں ان کے ارتقاء پر نظر ڈالنی ضروری ہے اور اگرچہ دونوں کا تعلق فراق و وصال اور عشق و محبت کی کیفیات سے ہے۔ مگر پھر بھی ان کا خط امتیاز جب تک نمایاں نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ ان کی تدریجی روایات کو ذہن میں نہ رکھا جائے۔

کشمیری ادب کی ابتداء لوک گیتوں سے ہوتی ہے۔ یہ لوک گیت عام طور دیہات کی کھُلی فضاؤں میں پلنے والے محنت کش اور سادہ منش لوگوں کے پُر خلوص اور سادہ جذبات کو سیدھے سادھے مگر دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان بظاہر سادہ الفاظ میں اُن کے دل کی دھڑکنیں اس انداز سے سموئی ہوئی ہیں کہ ان کی تاثیر آج کے مشینی دَور میں بھی چند لمحوں کے لئے ہمارے قلب و جگر کو

پگھلا کر رکھ دیتی ہے۔ ان ہی لوک گیتوں کے پس منظر میں لل دید کا قدِ آدم سایہ اُبھرتا ہے۔ اُس نے پہلی دفعہ لوک گیتوں کی روایات سے ہٹ کر سماجی، تاریخی اور فلسفیانہ موضوعات کو ایک سنجیدہ اور گمبھیر آہنگ میں بیان کیا۔ اُس کے واکھ اگرچہ عام لوگوں کی زبان پر ہیں۔ اور صدیوں سے سینہ بسینہ چلے آتے ہیں۔ مگر پھر بھی اُن کی بو باس آسانی سے پہچانی جا سکتی ہے۔ اس لحاظ سے وُہ کشمیری زبان کی پہلی صاحب طرز شاعرہ ہے۔ جس نے لوک گیتوں کے عام اور مقابلتاً سطحی پیرایہ اظہار کو الگ چھوڑ کر اسلوب کے نئے امکانات اور گفتگو کی ایک ارفع سطح کو متعارف کر کے ایک اہم کروٹ کی نشاندہی کی۔ اُس کے بعد اگرچہ کشمیری زبان میں بہت سی اچھی شاعرائیں اور شاعر پیدا ہوئے۔ مگر اُن میں نہ تو کسی کے یہاں زندگی محبت اور کائنات کا کوئی نیا تصور ہی ملتا ہے۔ اور نہ ہی بات کرنے کا کوئی مخصوص انداز اُبھرتا ہے یہی وجہ ہے کہ حبہ خاتون اور ارنہ مال کا اکثر کلام یا تو لوک گیتوں کے ساتھ خلط ملط ہو گیا ہے۔ یا ایک دوسرے سے اِن شاعراؤں کی بہت کم ایسی چیزیں ہیں جنہیں وثوق سے کسی خاص نام کے ساتھ منسوب کیا جا سکتا ہے۔ ان سارے شاعروں کا انداز لوک گیتوں کا ہی انداز ہے۔ وہی تصورات گفتگو کے وہی استعارے اور وہی ہیئت۔

ان گیتوں نے اگرچہ مقدار کے لحاظ سے شاعری کے ذخیرے میں کافی اِضافہ کیا اور کبھی کبھی اعلیٰ بیانیہ شاعری کے بہت اچھے نمونے ملے۔ مگر تصورات کی یک آہنگی جذبات کی ہمواری اور انداز بیان کے فرسودہ سانچے برقرار رہے جانے کی وجہ سے شاعری فنی عروج اور جذباتی پختگی کی کوئی فیصلہ کُن منزل طے نہ کر سکی۔ جس کی تاریخی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بیرونی اقتدار کے سامنے کشمیری زبان ہمیشہ نچلے طبقے کی ہی زبان بنی رہی۔ اور اُن کے دُکھ درد کا ذریعۂ اظہار اس کے برعکس تعلیم یافتہ اور ذہین طبقہ ہمیشہ درباری زبان کو اپناتا رہا گو کہ اُس زبان (یعنی فارسی) میں کشمیریوں نے غنی کے پایہ کا اُستاد اور بالغ نظر شاعر پیدا کر کے اپنی شعری صلاحیتوں کی دھاک بٹھا دی۔ مگر خود کشمیری شاعری کا حال بُرا رہا۔ اور اس میں وہی پامال

تصورات کار فرما ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے شاعر جو عام طور پر تعلیم سے نابلد ہوتے تھے اُن کے یہاں ایک ہی یکرنگ فضا ملتی ہے۔ اور اس دور کے کسی شاعر کا کلام پڑھکر کوئی مخصوص اثر پیدا نہیں ہوتا۔ محمود گامی کی شاعری بھی گو روایتی انداز کی حامل ہے۔ مگر اس لحاظ سے اہم ہے کہ اُسنے مروجہ تصورات کو ایک نشاط آمیز رجائیت سے گلنار کر دیا۔ اُس کے یہاں انبساط اور سرور کی ایک ایسی صہبا کا خمار ملتا ہے۔ جو روایتی پیمانوں میں ہوتے ہوئے بھی تاثیر کے لحاظ سے زیادہ پُر کیف ہے۔ اُس کے یہاں بحروں کے استعمال اور اُن کی پُر کاری میں ایک خاص لطف پیدا ہو گیا ہے۔ مگر اس کے باوجود وُہ کسی نئے رُجحان کا خالق نہیں قرار دیا جا سکتا

رسول میر کشمیری شاعری کا ایک اہم موڑ لیکر سامنے آتا ہے اور للہ دید کے بعد وُہ پہلا کشمیری شاعر ہے جس کے انداز بیان میں ندرت۔ جس کے تصور حسن و عشق میں انفرادیت اور جس کے اسلوب میں ایک نئی تازگی کی کونپلیں پھُوٹتی ہیں۔ اُس کی شاعری گو روایتی انداز میں شروع ہوئی۔ مگر اُسکا فارسی ادب کا مطالعہ اور پھر عشق کی ذاتی واردات کا تجربہ بُہت جلد پرانے سانچوں کے لئے اجنبی سا دکھائی دینے لگا۔ اور اس کے احساس حسن کی شدت اور جذبہ عشق کی توانائی نے پرانے خُم پگھلا کر ایک نئی شعری دُنیا تخلیق کی۔ وُہ عشق کی بالغ نظری اور حسن کی رمز شناسی کا شاعر ہے۔ اُس کے یہاں ہمیں عشق گلی کوچوں کی عام سطح سے اُٹھ کر ایک مرتفع اور بلند سطح پر متمکن نظر آتا ہے۔ اُس کے جذبات و احساسات کی حرارت نے اُس کے آہنگ پر بھی اثر ڈالا۔ اس لئے اس کے یہاں حسنِ بیان اور ندرتِ ادا کی وُہ بہار ملتی ہے جو اس سے پہلے کی شاعری میں عنقا ہے۔ اُس کے یہاں کشمیری شاعری (Folk Lore) کی منزلوں سے گذر کر تغزل کی نئی معراج تک پہنچ جاتی ہے اور وہ فارسی اور اُردو غزل کے مقابلے میں اپنی رعنائیوں کے ساتھ نکھر اُٹھتی ہے۔

اس پس منظر میں مہجور کی ادبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ مہجور نے ابتداء سے ہی دعویٰ کیا کہ وُہ رسول میر کی شراب نئے پیمانوں میں اُنڈیل رہا ہے۔ اور اُس نے اس رنگ میں مشق بھی کی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مہجور کے پاس نہ تو داخلی واردات کا وُہ خلوص تھا۔ جو رسول میر کا حصہ تھا۔ اور نہ ہی اُس کے احساس حسن میں اُتنی توانائی تھی۔ نتیجے میں وُہ رسول میر کی علامات کے استعمال کو ہی اُس کی تقلید سمجھ بیٹھا۔ اور اس طرح سے "تیغ بازس رزم سازس ترکتازس عارچھا" والی غزلیں وجود میں آئیں۔ جو تاثیر کی گہرائیوں سے خالی اور لفظی اُلجھاؤں کا گورکھ دھندا ہیں۔

مہجور کا دوسرا رنگ وُہ ہے۔ جب وُہ پھر آسان اور ہلکی بحروں والے روایتی ادب کی جانب باگیں موڑ لیتا ہے۔ جس کے لئے مہجور کے بہت سے پیشروؤں نے زمین ہموار کر رکھی تھی۔ اس رنگ میں ہیئت کی شعبدہ گریاں دکھانے کیلئے کافی گنجائش ہوتی ہے۔ اور اگر مہجور کے کلام کے بہترین حصہ کی تلاش کرنا ہو۔ تو وُہ اس حصے میں ہی مِل جائیگا۔ گو جب ان اشعار کا مقابلہ حبہ خاتون۔ ارنہ مال اور ایسے ہی دوسرے شاعروں سے کر دیا جائے تو یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ اُس نے اُن کی تخلیقات سے بہتر ادب کس نوعیت سے پیدا کیا ہے۔ کیونکہ اُس نے جو مضامین باندھے ہیں۔ ان پیشرو شاعروں کے کلام میں حسن۔ سادگی اور تاثیر کی آخری بلندیوں کو چھُو لیتے ہیں۔ اس وقت موقعہ نہیں ہے کہ ایسے شعر اور مہجور کے اس رنگ کے شعروں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جائے۔ پھر یہاں پر بھی مہجور کے کلام کا اکثر حصہ مفہوم کے کسی گہرے دباؤ کی عدم موجودگی میں سطحیت اور عامیانہ پن کی اُس دُھند میں لپٹ جاتا ہے۔ جس میں اعلیٰ ادب کی راہیں گم ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں مہجور کے ایسے رنگ میں ؎

داؤ صُبحک سُلہ اوس لاران
تنبہ لیو مُت کس تام ژھاران
خندہ پوشو کرس جایہ جائے
پایہ بِڈہ مسیانہ یاوُن رائے

جیسے حسین بند مِل جاتے ہیں۔ وہاں ایسے عام بند بھی ملتے ہیں جن میں رعائت لفظی کے سِوا کچھ بھی نہیں ؎

دِل میون تھو تون منز پھول دانن — یہ پھیلو سنبلستانن منز
ام کرنبدہ گی غنچہ دہانن — جائے تم رُٹ پرستانن منز

(میرے دل کو پھولدان میں رکھو۔ یہ سنبلستان میں پلا ہے اور غنچہ

دہانوں کی پرستش کی ہے)

مہجور کے دیوان میں ایسے اشعار کی تعداد کافی ہے اور اس بات پر دال ہے کہ جب کسی داخلی تحریک کے بغیر قافیہ پیمائی کی تلاش میں گھوڑے دوڑائے جائیں۔ تو شاعری کا کیا حال ہو جاتا ہے۔ پھر بھی مہجور جیسے شعراء کے یہاں یہ بات نبھ جاتی ہے۔ مگر جب اس سے کمتر درجہ کے شعراء اس میدان میں زور آزمائی کرتے ہیں۔ تو یہ مضحکہ خیز چیزیں پیدا کرتی ہے۔ جس کی مثال ہمارے چند زندہ شعراء کے کلام میں مل سکتی ہے۔ جو ہفتہ بھر ایک ایک مجموعۂ کلام تیار کرنے کے شہنر مند ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک فکر طلب نکتہ یہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ مہجور کا یہ رنگ کشمیری شاعری کی ترقی کا غماز ہے اور کیا اس میں ہمارے موجودہ دور کے مسائل کے اظہار کا کوئی امکان ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لوک ادب اپنی نوعیت میں لاکھ دلفریب اور سحر کار سہی مگر پھر بھی ادب و شعر کی مقابلتاً ابتدائی شکل ہے۔ اور یہاں سے آگے بلاغت تخیل اور فصاحت بیان کی اُن راہوں کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ جو ہر تہذیب یافتہ قوم اور زبان کا سرمایۂ افتخار رہتے ہیں۔ اور عظیم ادب کے عناصر ترکیبی بن جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ مہجور کی یہ کروٹ فن کی پیچیدہ گھاٹیوں اور ریاضت طلب منزلوں سے فرار کا درجہ رکھتی تھی۔ حالانکہ اس کے پس منظر میں چند سماجی اور سیاسی حقائق کی کارفرمائی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں اُس کے کلام کا وہ حصہ ناگوار بن جاتا ہے۔ جہاں اُس کی تصویر کشی عریانیت کی حدوں کو چھو لیتی ہے ؎

یارہ شستہ مارہ مت سارہ چھم نہ تھاوان
یارس لرہ پان ساوان چھیس
کامہ دلیہ یار چھنہ جامہ مژہ راوان

(محبوب کا ارمان مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ میں اُس کے پہلو میں سو جاتی ہوں۔ مگر وہ کپڑے نہیں اُتارتا)

کشمیری شاعری میں ایسے مواقع اور ایسے جذبات کا اظہار کوئی نئی چیز نہیں۔ مگر رسول میر جیسے شعراء کے یہاں ان کے بیان میں فنی نزاکتوں کا جو احترام ملتا ہے۔ اُس سے وہ ہیجان خیزی کے گھناؤنے پن سے بچ جاتے ہیں۔ ؎

ٹھہس گوم ہا لکلہ۔ درس گوم برے
ژس گوم والنجہ یار ما آم
اورہ تم سینہ دور یورہ مے نرے
فتے وسیئے یار کوت گوم

(کنڈی کھڑکی۔ دروازہ پر دستک ہوئی۔ مجھے واقعی وہم ہو گیا کہ میرا محبوب آ گیا ہے۔ (اور اس عالم تصور میں) میں نے اپنی باہیں وا کر دیں اور اُس نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ سکھی میرا دوست کہاں چلا گیا؟)

مہجور کی یہ روایت آگے چل کر عارض کی اُن نظموں کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ جب یہ پیرایۂ اظہار اور زیادہ نفرت انگیز شکل اختیار کر کے "تتہ مژہ راد تھ نالہ منہ سووم" جیسی نظموں کا قالب اختیار کر لیتا ہے۔

مہجور کے اس رنگ کا مطالعہ کرنے سے ایک اور دلچسپ بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ اُس کی شاعری چند جنسی اُلجھنوں کے غبار سے بھی لپٹی ہوئی ہے۔ مہجور کے کلام میں کبھی یہ اُلجھنیں عریانیت اور ایسے جذبات کی کھُلم کھُلا تشہیر کی صورت میں اُبھر آتی ہیں اور کبھی ایک موہوم اور ان جانے مفہوم کی حیثیت میں۔ اور اس کے کلام کا مطالعہ کرنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ بہت کچھ کہہ کے بھی اپنی تشکیک کی نوعیت کا مفہوم نہ سمجھ سکا۔

دوپ تھم ژہ تمے آنزون کیاہ چھوئی ژہ تمنّا
خمارہ ہیتو وارہ مے کُن کرنظر ونے
کرد جارہ دُل دُل مارہ منیو میانہ جنونہ تگ
مبتہ چھوئی نہ پانس تان لومادین تیز ونے

(تم نے آخری وقت پر مجھے پوچھا تو کیا چاہتا ہے۔ اے پُر خمار میری طرف غور سے دیکھ خود سمجھ جاؤ گے۔ یا تو تم میرے جنون کا کوئی علاج کرو۔ میں آپے میں نہیں ہوں۔ شاید کوئی ناگفتنی بات کہہ دوں)

مہجور کے اس پہلو کا تفصیلی جائزہ بجائے خود ایک طویل بحث

ہے۔

مہجور کی شاعری کا تیسرا رنگ اُس کی سیاسی شاعری ہے۔ اس بات سے انکار کرنا حقیقت سے مُنہ موڑنا ہے۔ کہ مہجور کے سر ہمارے ادب میں کھُلم کھلا سیاسی رُجحانات اور سماجی حقائق کو متعارف کرانے کا سہرا باندھا جائیگا۔ مگر یہ امر پھر بھی صحیح رہتا ہے کہ اُن کے سیاسی رُجحانات کبھی مبسوط اور مکمل نہیں رہے۔ اور اُس کی شاعری کا کوئی جوہر اس میدان میں نہیں کھُلا۔ مہجور کے کلام کا فنی عجز اُن جگہوں پر عروج پر نظر آتا ہے۔ جہاں پر اُس نے چند اُن تصورات کی تبلیغ کی ہے جو اُس کے لئے سُنے سنائے تھے۔ اور جن پر اُسے شعوری گرفت حاصل نہیں تھی۔ چنانچہ اس کا نتیجہ ایک تو بھانت بھانت کی بولیوں میں ظاہر ہوا۔ اور دوسرے اُس کی شاعری اُس منزل تک پہنچ گئی۔ جہاں شاعری اور نثر کی سرحدیں معدوم ہوجاتی ہیں۔ مگر چونکہ یہ وقت کا راگ تھا۔ اور بقول مہجور "وچھت مہجور نوہ رس کون۔ نوی زنگاہ یوان ہا دُن"۔ لہٰذا مہجور کی یہ سیاسی نظمیں ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔ اور خود مہجور اس قدر دانی کی وجہ سے اپنے پہلے دو رنگوں سے نکل کر آخری دَور میں بالکل سیاسی نظمیں کہنے لگے۔

مہجور کی سیاسی شاعری کا درجہ متعین کرنا ہو تو اُس کے ہمعصر آزاد کے ایسے کلام کا مطالعہ ضروری ہے۔ آزاد کی ادبی زندگی مہجور کے سائے میں شروع ہوئی۔ مگر اُس کی شاعری بہت جلد نکھر اُٹھی۔ اور مہجور کے نسائیانہ لب ولہجے کو الگ چھوڑ کر اُس کے کلام میں تحریک آزادی کا وُہ سارا ولولہ، جوش، وقار اور خود اعتمادی ڈھل گئی۔ جو اس کا خاصہ رہی ہیں۔ اُمنگوں کے اُبال اور ارمانوں کے زیر و بم کے اس وقت میں بھی مہجور عاجزی کے ساتھ اپنے سر کو سنگ آستان پر جھکانے کی اجازت ملنے پر بھی نازاں نظر آتا ہے۔ مگر جب آزاد سر جھکاتا ہے تو اُس کی شان یہ ہوتی ہے ؎

فولاد ژایم نار ژالم خون جگر چیوم
از تام ژہ روس کینسہ بر ونہہ کنہ یونہ یہ سر موں

(میں نے فولاد چبا ڈالا۔ آگ کے لقمے لئے اور خونِ جگر کے جام پیئے۔ مگر میرے محبوب تیرے سوا میرا سر کہیں اور نہ جھک سکا۔)

آزاد کے یہاں ہمیں تحریکِ حریت کی زندہ اور جواں تصویریں ملتی ہیں اور وُہ نئے تصورات ملتے ہیں۔ جو ایک نئے خروش اور زلزلے کی پیداوار تھے۔ اُس کے یہاں حیات، کائنات، عشق، محبوب اور عاشق کے جاندار اور صحت مند تصورات کی آبیاری ہوتی ہے حالانکہ مہجور کی اس قسم کی کوئی خصوصیت اتنی دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ چنانچہ جوں جوں کشمیری ادب ارتقاء کی منزلوں کو جانے لگا۔ مہجور کو اپنی کوتاہیوں کا خود بھی احساس ہوگیا تھا۔ اور آخر پر وہ عوام کے جمگھٹوں سے الگ رہ کر خلوت نشین ہوجانے کی تمنّا رکھتے تھے۔ اور "چھ اکثر پاک سیرت ژٔہ یہ روزان دورہ لوکو نِش"، کہہ کر اس نئی کروٹ کا سامنا کر رہے تھے۔

مہجور ہماری ادبی بساط کی اہم ترین شخصیتوں میں سے ہیں۔ اور اُنہوں نے شعروفن کی جو آبیاری کی ہے اُسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مگر کشمیری ادب کے طالب علموں کو اُن کے کلام کی کوتاہیوں پر بھی نظر رکھنی چاہیئے۔ تاکہ غلط تقلید اور فن کو سہل نگاری سے نبھانے کے رُجحانات کی حوصلہ شکنی ہو۔ خاص کر جبکہ آویزش اسوقت شروع ہو چکی ہے۔ ایک طرف شعراء کی وُہ صف ہے، جو ہیئت کے سحر اور موضوع کی سطحیت کا سہارا لیکر پھر سے کشمیری ذہنوں کو سنجیدہ مسائل سے دُور رکھنا چاہتے ہیں۔ اور دوسری طرف بالغ نظر شعراء کی وہ صف ہے جو مہجور کے کلام کی بہترین روایات کو سمیٹ کر بھی ایک نئے لب ولہجے کو متعارف کر رہی ہے۔ ان شعراء کے یہاں رسول میر، آزاد اور مہجور کے رنگوں کی شوخ قوسِ قزاح ایک نئے روپ اور رعنائی سے جلوہ گر ہے۔ اور یہ ماضی کے ادب کی بہترین روایات کو سمیٹ کر اسے اپنے خونِ جگر سے نئی وسعتیں عطا کر رہے ہیں۔ اس طرح ہماری شاعری کو رفعت کے نئے اُفق مل رہے ہیں۔

ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو

مہجور کی شاعری کے چند فنی محاسن

کشمیری شاعری عرصۂ دراز سے معمہ گوئی تصوف اور عجیب قسم کے مابعد الطبیعاتی خیالات کا مرکب بن چکی تھی۔ اور دور از کار تصورات نے اس سے اس کا لوچ اور رس چھین لیا تھا۔ جس کی آبیاری حبہ خاتون سے لیکر رسول میر تک بہت سے شعراء کرتے رہے مہجور کا یہ کارنامہ کیا کم ہے کہ انہوں نے کشمیری کو اس کا عوامی کردار از سر نو عطا کیا۔ اور ایک زندہ جاوید ادب کی بنیادیں استوار کیں۔

مہجور کشمیری ادب کا ایک بہت ہی اہم شاعر ہے اور اس کے لئے اُن کی چند خصوصیات ذمہ دار ہیں۔ مہجور کشمیر کی تاریخ کے جس ہنگامہ خیز دور میں جیا۔ اس کے تمام نشیب فراز اُن کے کلام میں موجود ہیں۔ مگر قطع نظر اُن کے سیاسی کارناموں کے محض ادبی حیثیت سے انہوں نے کشمیری شاعری کو بہت سے محاسن بخشے۔ اولین بات یہ ہے کہ اس سے پہلے اس کے چند گنے چنے موضاعات تھے۔ مگر انہوں نے اس کو زندگی کے اور قریب لایا۔ کشمیری داستانیہ، مثنویوں کو چھوڑ کر جہاں مناظر فطرت کا ذکر محض ضمناً آیا ہے۔ مہجور نے اس شاداب خطۂ زمین کے حسن خداداد کو اپنی قلمی تصویروں میں بند کر دیا۔ اہر بل، آرہ بل، گنگہ وٹن۔ لوٗس۔ سوکھ ناگ، نیلہ ناگ وغیرہ کے جیتے جاگتے مناظر کی نادر تصویریں مہجور کی شاعری میں محفوظ ہیں۔

مہجور کی شاعری میں گل و بلبل کا تذکرہ بہت ہے۔ مگر اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں کی داد دینی پڑتی ہے۔ کہ انہوں نے ہر جگہ کس نئے پیرائے اور کس فنی حسن کے ساتھ اس کا نباہ کیا۔ چنانچہ جہاں ان چیزوں کا ذکر آیا ہے۔ وہاں ماحول اور روایت کے مطابق طوطہ، ون ہاٗر، ٹیکہ ٹن اور ورگیم کا استعمال پورے فنی التزام کے ساتھ ہوا ہے۔ مہجور کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کشمیری لوک دھنوں اور مقبول عام بحروں میں غزلیں کہیں۔ اور اس طرح سے کشمیری شاعری اور کشمیری موسیقی کے اُس فرق کو دور کر دیا۔ جو صوفیانہ طرز کلام اور صوفیانہ موسیقی کے مروج تصور نے پیدا کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مہجور کا کلام کشمیری عوام کے لئے ایک خوشگوار جھونکے کی طرح حیات بخش ثابت ہوا۔ مدتوں کے رکے بند کھل پڑے اور کشمیر کی فضاء میں ہر جگہ مہجور کے ترانے دل کش دھنوں میں سنائی دینے لگے۔

مہجور کا کلام جہاں اپنے اندر بے شمار سیاسی اور سماجی تحریکوں کو سموئے ہوئے ہے۔ وہاں اس میں باریک فنی نزاکتوں کی بہار بھی ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی بحروں اور سیدھے سادھے الفاظ کے استعمال سے ایسے ہر کا شعروں کا تانا بانا بنتے ہیں کہ سماں بندھ جاتا ہے۔ ذیل کے چند اشعار سے پتہ لگ سکتا ہے۔ کہ یہ فن کار اکے دُکے الفاظ سے کھیل کر کیا طلاطم بپا کر سکتا تھا۔

از روز وسانے   دلبرہ میانے
بوز ننہ بانے   دلبرہ میانے
لولہ ہوت میون پان۔ لوو گرِ شہ براران
لول با پرانے   دلبرہ میانے
شبنم مختہ ہار۔ ویرہ چانے کور نیار
کم شوزہ شانے ۔ دلبرہ میانے

(آج ہمارے یہاں رہ محبوب۔ سن میرے حسین دوست۔

آج میرے یہاں رہ۔ میرا محبت بھرا دِل عمر کی کتنی منزلیں طے کرے مگر کہیں محبت پر خزاں آ سکتی ہے؟ میرے پیار شبنم نے موتیوں کا ہار تیرے لئے کِس پاکیزگی سے تیار کیا۔ میرے دلبر۔ میرے یہاں رہ)

آپ نے اشعار میں جدت طرازی اور باریکی سمو کر کشمیری غزل کو لطیف بنایا ہے۔ دیکھئے صبح کے وقت کلیوں کے چٹکنے کو کِس ادا سے بیان کیا ہے ؎

واو صحک شلہ اوس لارا ن
تنبہ لیمت کس تام ژ ہارا ن
خندہ پوشو کرس جائے جائے
پائہ بڈہ میانہ یاون رائے

(نسیم سحری صبح سویرے ہی دوڑتی بھاگتی جا رہی تھی۔ (کچھ تلملاتی سی کسی کی تلاش میں وہ اتنی سہمی ہوئی تھی کہ ہر جگہ پھولوں نے خندہ زنی کی۔ میرے بلند مرتبہ بچپن کے دوست)

نسیم صبح کا گلستان میں شبنم سے پھولوں کو نہلانے سے "دامانہ چھلن" کا مضمون پیدا کیا ہے ؎

لوٗہ ہر تہ چھنہ ریمژ مسول ونان چھ داوس
دامانہ میون یم چھوٗل تس زاہ قرار آسیا

(شبنم کی تری سے لت پت اور کچھ گھبرائی ہوئی مسول (جنگلی گلاب) بادِ صبا سے یوں کہتی تھی کہ میرا دامان جس نے دھو ڈالا۔ وہ بھی ہمیشہ بیقرار ہو گا۔ دامان دھونا کشمیری میں غیبت کرنے کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شبنم پھولوں کی پتیوں پر جم کر ان کو نہلاتی ہے۔ سورج چڑھنے کے ساتھ ہی شبنم بے قرار ہو کر اڑ جاتی ہے)

کسی کی یاد میں آنکھوں سے آنسو کا جاری ہونا یوں بیان کیا ہے ؎

خون گوم جاری اوٗش ہاٗر ہاری
قلہ قلہ گوم محنتہ ہار مد نو

(میں اتنا روئی کہ آنسو کے بجائے آنکھوں سے خون جاری ہوا۔ جو آنسو بہے وہ تو موتیوں کے دانے تھے جن سے کوئی ہار تعمیر

بنا تھا)

نوادر:۔

مہجور نے خیال کی باریکیوں کو اپنے کلام میں ایسے بنایا ہے کہ دیگر زبانوں کے اساتذہ کے کلام کے ہمدوش کیا ہے۔ ذیل میں چند نمونے درج ہیں جن سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

خان خاناں:۔ بہ جرم عشق توام مے کشند غوغائیست
تو نیز بر لب بام آ چہ خوش تماشائیست

مہجور:۔ خستہ دل میون بستہ گومت لولکس زالس اندر
کیا تماشا چھنہ نیرنہ ہے اکھ دماہ راورنہ ہے

(میرا خستہ دل محبت کے جال میں پھنس کر تڑپ رہا ہے۔ ایک نادر تماشا ہے۔ محبوب ذرا سی فرصت نکال کر دیکھنے تو آؤ۔

عرفی:۔ عرفی اگر ز گریۂ میسر شدے وصال
صد سال مے تواں بہ تمنا گریستن

مہجور:۔ وَدنہ سیتن ید اثر گژھ ہالس سنگین دلس
رات تہ دوہ دوشوی اچھن کیٗن خونِ باراں ہارہ ہا

(اس سنگدل معشوق کے دل پر اگر میرے رونے سے کوئی اثر ہوتا تو میں رات اور دن برابر دونوں آنکھوں سے آنسو کی بجائے خون کی بارش بہاتا)

ظاہر ہے کہ مہجور نے چند سال کی قید ہٹا کر "رات تہ دوہ" یعنی ہمیشہ کہہ کر اور آنسوؤں کی بجائے خون باران آنکھوں سے بہا کر استاد کے شعر کے معنی اور خوبی میں کتنا اضافہ کیا ہے)

ذوق:۔ گل پریشان ہوا ہنس کر چمن میں آخر
دیکھ اے غنچہ یہاں خندہ زنی خوب نہیں

مہجور:۔ پوشہ ٹوٗر خاموش پورہ سا مانے
ژھوپہ چھے روپہ سنز پانے لوز
کتھ سیئت بوے گل گو پریشانے
بُلبلہ سند افسانے لوز

(اپنے انداز میں کلیاں جھک (رازِ عشق) چھپائے ہوئے خاموش ہیں۔ اُن سے ذرا سی غفلت ہوتی ہے کہ چٹک کر پھول بنتی ہیں اور

پھولوں سے خوشبو ہر سمت پھیل کر زائل ہوتی ہے۔ راز کی بات کہتا ہوں۔ خاموش رہنا عقلمندی ہے۔ الغرض خموشی معنئ دارد کہ در گفتن نمے آید)

برسوں کی بات ہے جب راقم نے یہ ہم معنی اشعار مہجورؔ کو سنائے وہ اچھل پڑے اور بہت محظوظ ہوئے۔

غالب :- کرنے گئے تھے اُن سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نظر کہ بس خاک ہو گئے

مہجورؔ :- ژلہ لارہ وچھہک حال ونہ ہے وارہ وچھو ہے ردئے
گلہ زیوہ گیم اوش وتھم ددہ رائے ونے کیاہ

(تم کہیں جلدی میں جا رہے تھے جب میں نے تمہیں دیکھا۔ میری آرزو تھی کہ جی کھول کے دیدار کروں اور تمہیں اپنا سب حال دل سُناؤں۔ لیکن تمہیں دیکھ کر میں کچھ بول نہ سکی صرف آنکھوں سے آنسوں رواں دواں بہنے لگے)

اور دیکھئے جب مہجورؔ کا شعر کانوں میں پڑتا ہے کہ ؎
لگمت ممتس چھو پرس کیاہ تام میون ووُن ہس
نتہ ونتہ بے سبب تس چشمن خمار آسیا

(معلوم ہوتا ہے کہ رقیبوں نے اسے میرا بُرا بھلا کہہ کر اُس کو اپنی بزم میکشی کی خو ڈالی ہے۔ نہیں تو کیا وجہ ہے اُس کی آنکھوں میں شبینہ خمار جھلکتا ہے)

تو مناسبت سے استاد کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎
تو شبینہ مے نمائی بہ بر کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

شیلی :- O wind! if Winter comes, can spring be far behind.

مہجورؔ :- یو دسورہ شراوُن واوہ ہر ونہ پوش تراون کرو
ہر دس نہ چھنہ بتہ پائداری وارہ ژتس تھاوُ

(اگر ساون کی برساتی بہار بھی ختم ہوا اور موسم خزاں آ بھی جائے اور اس وجہ سے پھولوں کی بہار یکسر ختم بھی ہو جائے۔ لیکن یاد رکھو کہ موسم خزاں بذات خود ناپائدار اور فانی ہے۔ خزاں کے

تعمیر

بعد بہار یقینی ہے)۔

غنی :- حسن سبزے بہ خط سبز مرا کردہ اسیر
دام ہم رنگ زمین بود گرفتار شدم

مہجورؔ :- والہ واشن چانہ بابت والہ بُرزائل کڈکھ
پوشہ تھرہ اند اندہ ہوی مازالی تے سبزار جھوی

(بالوں کے حلقہ ہا کو تیرے لئے اور بھی چھوٹا بنایا گیا ہے۔ تاکہ نظر نہ آسکیں بے خبر دیکھ تو سہی کہ گلوں کے ساتھ جال اور سبزہ زار ہمرنگ بنا ہوا ہے۔ کہیں بے خبری سے جال میں اُلجھ نہ جانا۔

غالب :- ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا ہے مرے آگے

مہجورؔ روئے مصحف زلف کافر روبرو
وُنتہ وسئے کور کُن لاگون دل

(معشوق کا روئے زیبا (مشابہ مصحف مجید) اور زلف سیاہ (کافر) دونو غضب ڈھاتے ہیں۔ سکھی یہ دونو ایک سے بڑھ کر دوسرا حسین ہیں۔ بھلا ہم اپنے دل کو ان دو میں کس ایک پر فدا کریں)

جہاں اقبال یہ کہہ کر ؎
دِ داغ غنچہ میں ہے راز آفرینش گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دار ہستی ہے

جینے اور مرنے کے راز کو ایک طرح خاص سے ادا کرتے ہیں۔ وہاں مہجورؔ کے لئے یہی گلؔ اسی حیات و ممات کا راز یوں منکشف کرتا ہے ؎

گل ہردہ ہران سونتہ بیہ دوبارہ اگران دُور
مرُ مرُ چھ پھیران زندگی وسواس مرنک تراؤ

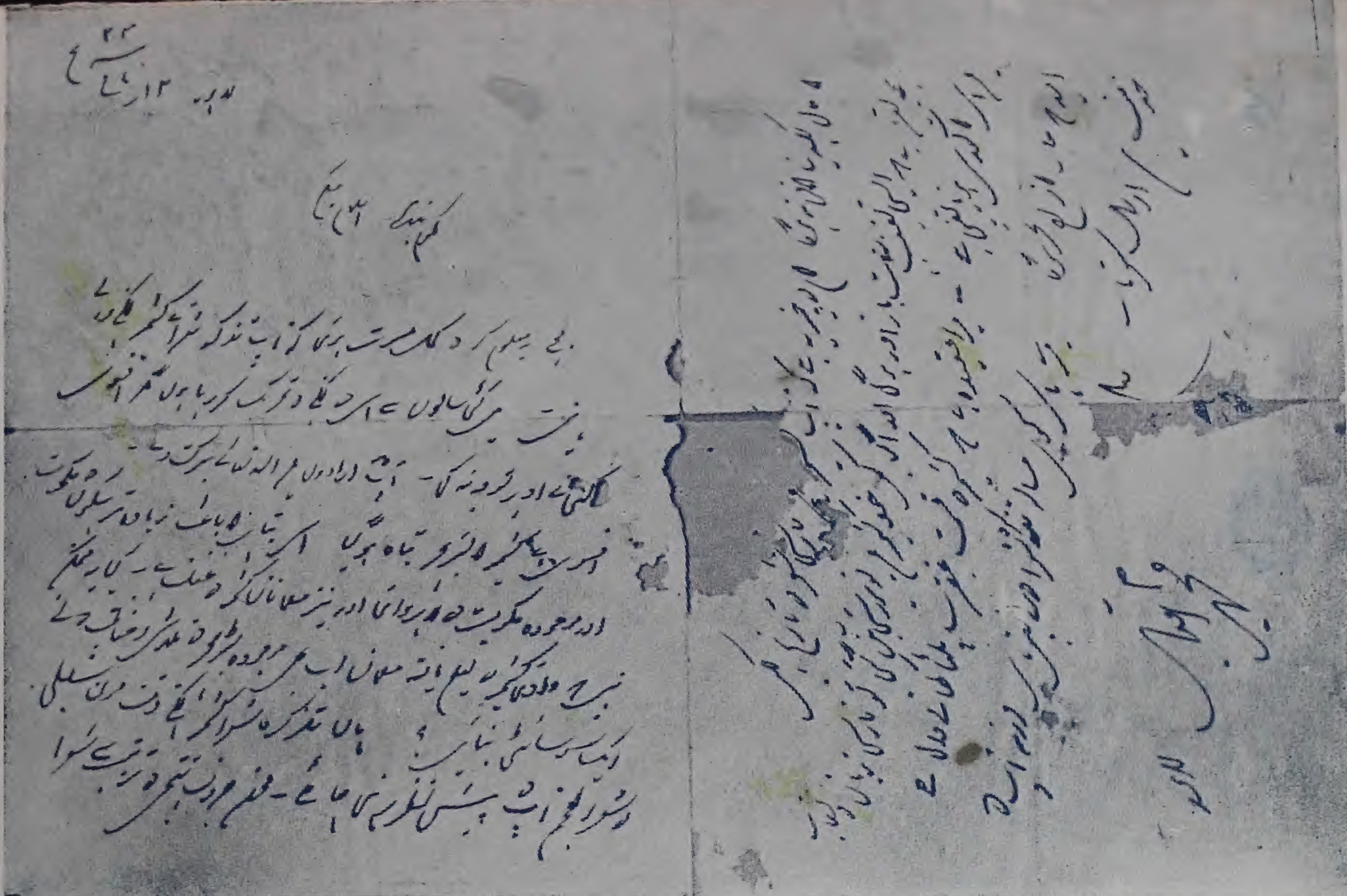
(بہت جھڑ کے موسم میں پھول جھڑ جاتے ہیں۔ بہار آنے پر پھر حاضر ہوتے ہیں۔ یہاں تو مر مر کے پھر سے زندگی ملتی ہے۔ مرنے کا ڈر چھوڑ دے۔

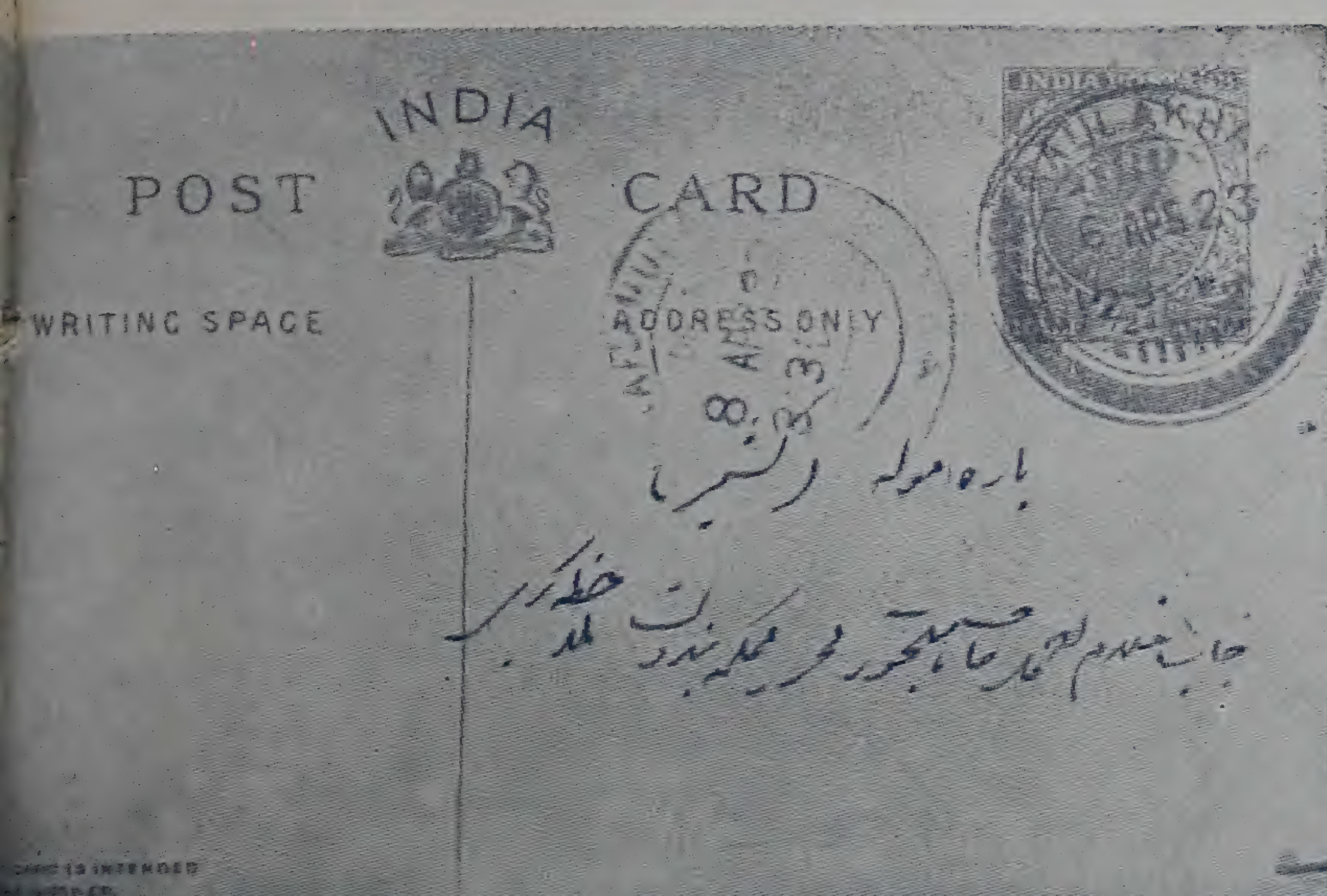
یہ آخری شعر اُن کی سنگ تربت پر کندہ ہے۔

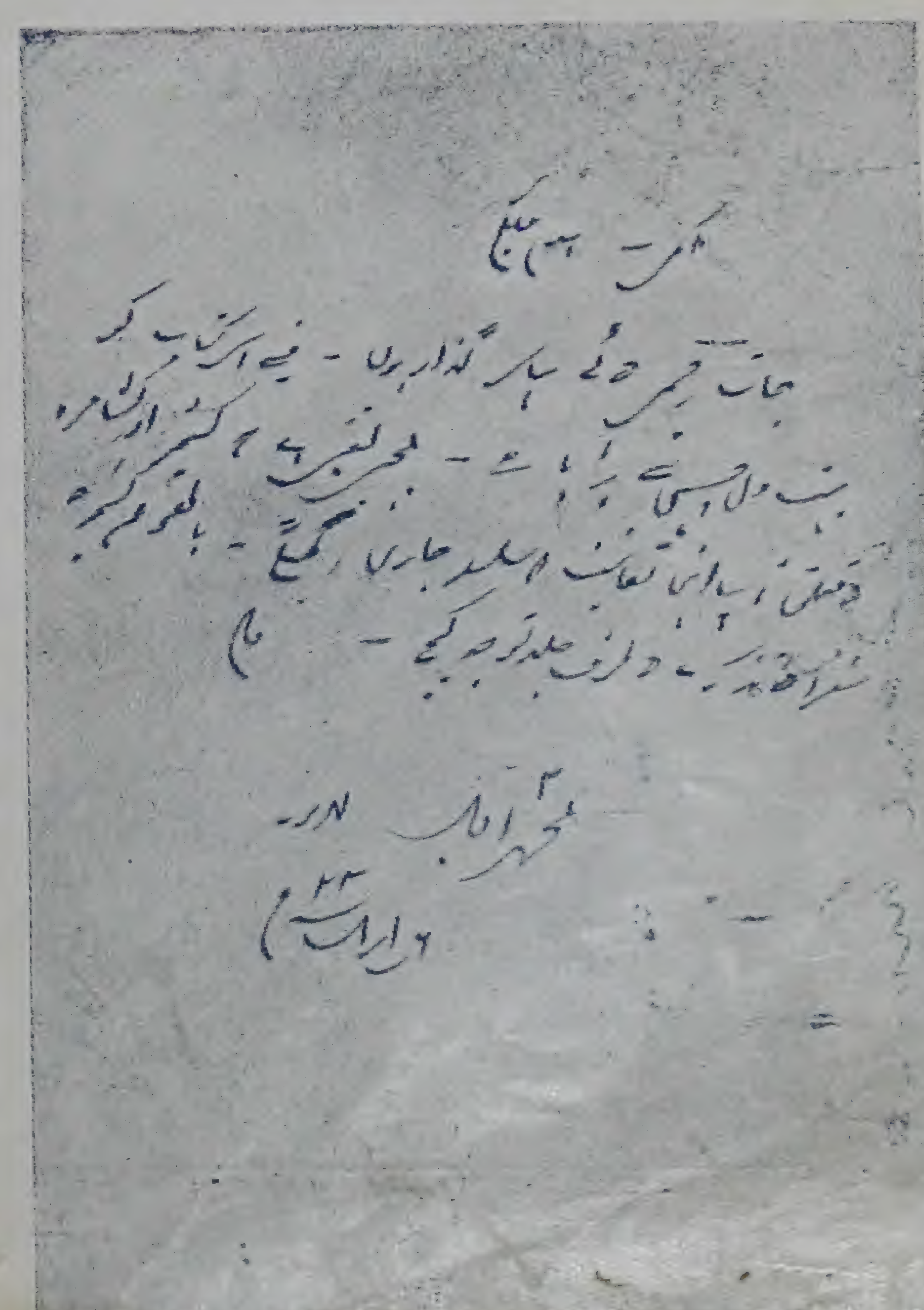
مہجورؔ کے ذکر کے سلسلے میں یہ کہہ دینا بھی مناسب ہوگا کہ انہوں نے قصیدہ نگاری اور مرثیہ نگاری پر کبھی توجہ نہ کی۔ بہر کیف جوں جوں زمانہ [illegible]



حضرت غلام احمد مہجور







حضرت مہجور کے نام علامہ اقبال کے دو خط

غزل -

ژٕ پتھ دلدارہ بنزہ رادم جوانی ے فنا ژے پتھ کرم مےٚ زِندہ گانی ے

خبر چھا دشمنو کیا کیا ونوی میون ے دلس منز پیدہ کرہ ے بدگمانی ے

یہے آسس میانِ دشمن چانِ بدخواہ ے بنیمت از تمے چانِ یارِ جانی ے

مےٚ دورُم سینہ بندوقن تہ توپن ے ژٕ ما زُوو ژٕلس میانین جانفشانی ے

ژٕ میانن بدخہن سیت جورہ ماران ے بوچھس اللہ وان ڈُنہ تیم زخم برانی ے

مشہر نالان - شہر ساری پریشان ے شُو بیاہ پتھر نولہ شہرس حکمرانی ے

ژٕلس یاو آدہ نک تیم وعدہ ساری ے تیم آسیا وعدہ کنہ آسس قصہ خوانی ے

بوچھس دوتہ خوتہ دوتہ سپنان پامال ے یہ چھم امہ چانہ نولچ مہربانی ے

ژٕلس یاو ناپسندیم کار آسی ے تمے کار چھیک ژٕ کرہ نادرانہ عیانی ے

وچھان لوکن بوچھان یم زلفِ شبہار ے یمن تھو فرچھہ حسنچ پاسبانی ے

رنگیم تیر مژگان قتلہ نشہ پتھ ے چھہ یم وارن غریبن پہلوانی ے

زمینک راج چھینہ رٹو کامہ دیون ے وُفِن زوتہ نیو تہ پتو تنہ آسمانی ے

مقابلہ اکھ اکس ٹھرن تہ کوت تام ے یہ طاقت چون تے میانین ناتوانی ے

دنیہ کیا کم چھہ جابر کم چھہ کمزور ے چھہ یم مظلوم تمے ظالم چھہ جانی ے

بیان کرہ کیا - لکیت کیا تھاوہ مہجور ے
ستم چانی یاد چھس ساری زبانی ے

مہجور کی اپنے ھاتھ سے لکھی ہوئی ایک غزل کا عکس -

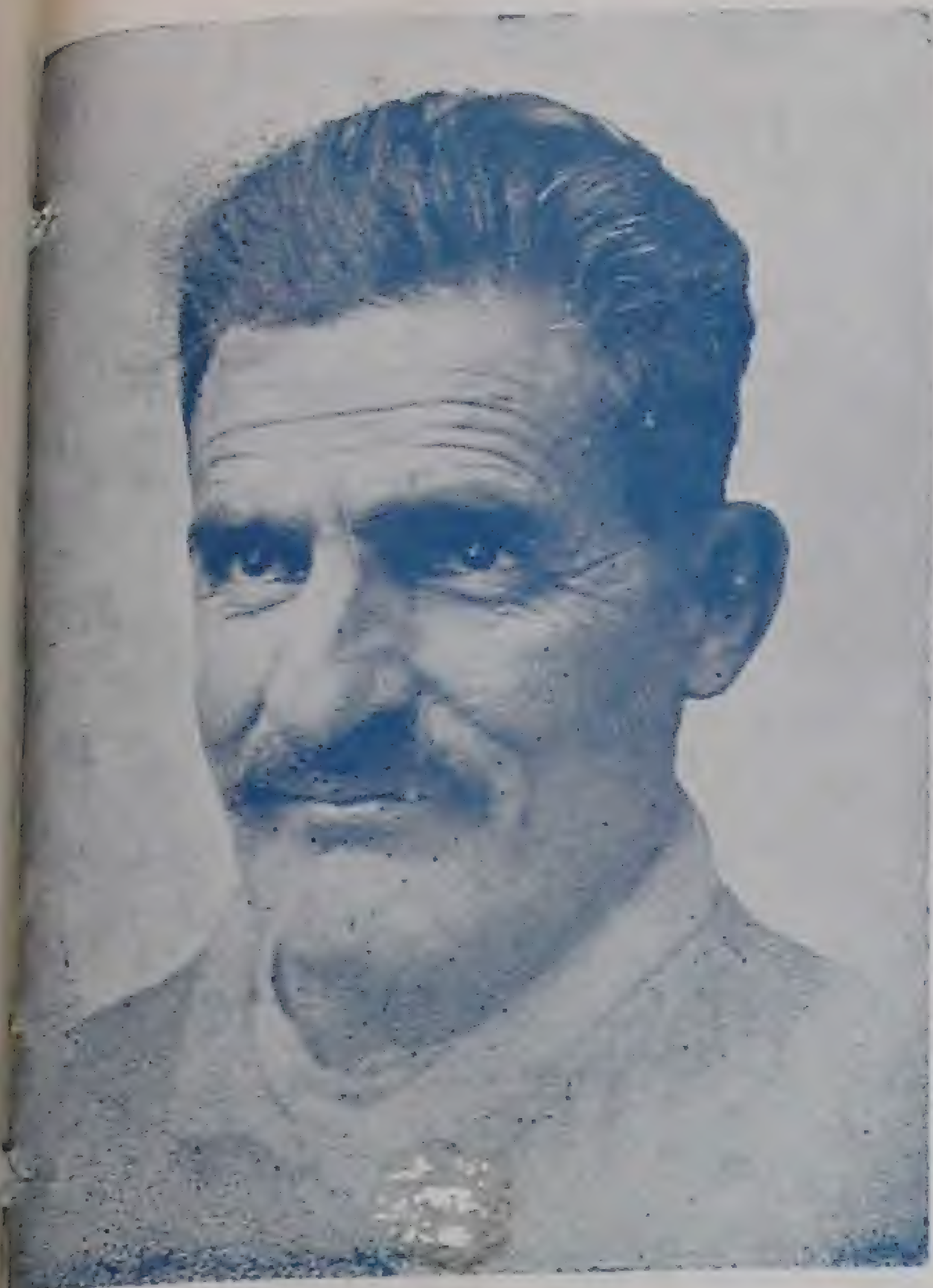
نہ درم بیا میزند و اسپ را بدہند کہ نافع باشد، گر دوای مختصر بیارد یک سیر خرما و نہ درم
برگ بانسہ سبز یکجا بکوبند و اسپ را بدہند گر پاپرہ و بانسہ سبز از ہر یک نہ درم با نیم سیر
شہد بیامیزند و اسپ را بدہند و باید کہ درین علت ولیدہ اسپ از جو باشد کہ مفید
و نافع است باب سیزدہم در معالجہ اسپی کہ علت خواق پیدا کند و بزبان ہندی
ہر کی گدبند چون در سینہ اسپ این علت پیدا شود از باد زور کند و از سینہ اسپ
بحلقش آید و اگر درین زحمت و جمع پیدا کند البتہ بزید و این علت از بد مغیی

مہجور کی خوشنویسی کا ایک نمونہ

کل ہم آئینے میں رخ کی جھریاں دیکھا کئے
کاروان عمر رفتہ کے نشان دیکھا کئے



۳۰ سال کی عمر میں



۴۰ سال کی عمر میں



طویل بیماری سے روبہ صحت ہونیکے بعد



۴۵ سال کی عمر میں



۶۵ سال کی عمر میں

ماتمِ مہجورؔ

(مرثیہ ہفت بند)

عبدالمجید سائِر

چھُ دُنیا ناوِنُن بازار ہے ہے ؎ چھُ کرِ اتھ کینۂ زانتھ انکار ہے ہے
بقائی چھنہ یتہِ پوشُن چھُنہ زاہ ؎ فنائی کیُت چھُ گُل سمسار ہے ہے
دیانی یِن گژھن تہِ روزہ موجود ؎ یعقوبی بہ عالمک دیدہ ہار ہے ہے
تماشا چھُوی یہ اکھ بازی گری ہُند ؎ دِلیران بازیاہ چھُ بازی گار ہے ہے
سراسر کارِ دُنیا بے وفائی ؎ برابر چھُوئی یہ بدکردار ہے ہے
دِیان آسے دُنیا ہس جانانہ کم کم ؎ مگر میژہِ سیٹھ گوکھ ژار ہے ہے

گھرہ غمنئی ہندی دُنیا چھُ آخر
یہ آباد سربسر شنیاہ چھُ آخر

چھِ از خلقت ژُوپارِ ماتم کرانی ؎ دُچھان چھُس ہر طرف نوحہ خوانی
رِوانی از چھِ گُل پوشے لترِن بیٹھ ؎ چھِ بلبل منز گلستانن ودانی
لباسِ ماتمی وولُمت چھُ سبزن ؎ چھُ دُدِتھ ہیو ژوپارِ لبنہ یوانی
گُلو تے بُلبُلو چھِی جامہ ژٹمِت ؎ بہارک رنگ چھُ گومُت نن خزانی
رِوان شبنم ودان چھِی واو صُبحک ؎ چھُ بوئے ماتمی گلشن دِوانی
سبب امہِ ماتمک کیاہ چھوی جہانس ؎ ونان ییِ ہارِ طوطہ یانہ وانی

چھُ کوہ سنہ از رِوانی ملکِ کشیر
چھُ کس سنہ از ودانی ملکِ کشیر

جہانس چھیئے فنائی ہائے افسوس ؎ چھینہ یتہ کُنہِ بقائی ہائے افسوس
یہ غمی اُڈران بس آدمس پھٹے ؎ بنیس کرِ غم دفائی ہائے افسوس
سَرہ سپدی ذرا چشمہ مُوزر ژئی ؎ چھُ دُنیا بے وفائی ہائے افسوس
غمن دادین پیتے ہرگز چھُنہ ژھین ؎ تھوُن یزہ دل رِفنائی ہائے افسوس
غمک سیلاب از کشمیر سئی آو ؎ ونُکس بے نوائی ہائے افسوس
جوان و پیر چھِی از ماتمس منز ؎ چھُنہ کانہہ غم سوائی ہائے افسوس

ونان گو گوت سنا مہجورؔ سونُی
توے از زونہ لوگمُت چھُوئی یہ گرونی

دِیان گو از جہاں دلدار مہجورؔ ؎ سُو رُت رنگیں گُلِ گلزار مہجورؔ
سخنور شاعرِ شیریں زبان سون ؎ سُو بُلبُل ہیو شکر گفتار مہجورؔ
پھِران اوس لولہ مس منز لولہ کھاسین ؎ ونان اوس لولہ کی اسرار مہجورؔ
بھران اوس لول دمہ دمہ انقلابس ؎ کران اوس کاشرِن بیدار مہجورؔ
اول بوزِ دِی چھُ کاشرہ شاعری منز ؎ سیاستکوئی علم بردار مہجورؔ
زبانِ شعر اوسُس لول و اُلفت ؎ کران اوس لولہ کُوئی دیدہ ہار مہجورؔ

سراسر کرِ زمانن بے وفائی
اچانک دِتنہ اسہ داغِ جُدائی

وتی وُن کُس اکھاہ افسانہ لولکُ ــ کرہی پیداوُنتھ کُس ...، زلولکُ
شمع لولکُ زٔھیتہٕ گو منز کشیرِ ے ــ ونتھ کتہٕ ژھارُن اُس پروانہ لولکُ
کرہی باپار بیہ کُس لولہ کو ئی وونِ ــ بیہ مُژہ رادہٕ کُس دوکانہ لولکُ
بنی کُس لولہ مجنون عالمس منز ــ بنت کُس نیرہ بیہ دیوانہ لولکُ
گُلن تے بُلبلن کُس لول بھرہ وونِ ــ وُنتھ کُس بیہ شیرہ گُلشن پانہ لولکُ
چُھہ مے باقی مگر ساقی ژٕدلُوئی کوت ــ دِپان تم سیت نیُو پیمانہ لولکُ

بیرونق گو یہ میخانہ کشیرِ ے
بنی کتہٕ یُحفہ سُخندانہ کشیرِ ے

چُھہ بوڈ افسوس اما ہیجوٗر کوت گو ــ اسے نشہ اوس نزدیک دُور کوت گو
ہیوان اوس داد سوزس نہ سازس ــ پران اوس نغمۂ منصور کوت گو
کشیرِ ے منز سو شمع شاعری اوس ــ اما تمہٕ شمعکوئی سُوئی نُور کوت گو
ادب کشمیر کوٗئی گو زیور ے روس ــ چُھہ افسوس ادکوٗئی کتہٕ دُور کوت گو
سپُد بے سر یہٕ مُلکِ شاعری ہے ــ سُخندانی ہندوئی فغفور کوت گو
ستارہ شاعری رُود ژھایہ ابرس ــ کورُن ژورے بہٕمن منظور نوت گو

پِچھ کرِمت دُوررِن ہیجوٗرٕ ننڈ گیر
کران ماتم چُھہ ہے ہے ملک کشیر

کران پرِتھ ساتہ ازگریانہ کشمیر ــ بنیو از ماتمکُ سامانہ کشمیر
غنچہ زنجیر ہیرہٕ بونہ گیہ کشیرِ ے ــ چُھہ نالِ ہیتھ ماتمکُ زولانہ کشمیر
دِلس داغِ جُدائی یِرتھ اکس چھُوئی ــ چُھہ للہ وانی غمکُ طوفانہ کشمیر
کران پیرو جوان از نوحہ خوانی ــ بنیومُت چھُوئی تِمے غمخانہ کشمیر
جہانس نالہ زاری چھے ژٕدپاری ــ چُھہ اوش ہاران چشمہ پانہ کشمیر
زمانن رُود تُزدہ رُود رستمن غمن ہُنْد ــ یِران از چھُوئی تِمے افسانہ کشمیر

ودان کشمیر چھُوئی از نغمہ خوانس
تمس ہیجوٗر سئی شیرین بیانس

مظفر عازم

مہجور کا تصورِ محبوب

مہجور کی سادگی اور پُرکاری عشق و محبت ہی تک محدود نہیں ہے۔ اُس کی نظمیں اور غزلیں ہماری تحریکِ حریت میں ایک نمایاں رول ادا کرتی رہیں لیکن پھولوں کی وادی کے اس زمزمہ خواں کے جوہر حسن و عشق ہی کے میدان میں کھلے۔ اُس کے ہاں جلال کم اور جمال زیادہ ہے۔ جوش و خروش پر سوز و گداز کا پلّہ بھاری ہے۔ شعلہ و شرر کی بات کم، خنکی و شبنم کا ذکر زیادہ ہے۔ بجلی کوندتی ہے تو اس کو ایک نازک بدن، سرخ پوش کا تصور آتا ہے، جو پریم رس بانٹ رہا ہو۔ اُس کا لب و لہجہ واعظانہ نہیں۔ وہ ہمارے جذبات کے نازک تار چھیڑ کر ہمیں اپنے جذبات کے آہنگ کے قریب لے جاتا ہے اُس کے کلام کی یہی لطافت اور نزاکت ہے۔ جو ہمارے دل کی گہرائیوں میں اُس کے لئے ایک مقام پیدا کرتی ہے۔ اُس کے ساز کے تار جب حرکت میں آتے ہیں، تو ہمارے جذبات میں ایک ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ جو ہمیں مست و بےخود ہی نہیں کرتا ــــ بلکہ ہماری نظر کو شوخی اور بےباکی بھی بخشتا ہے۔

محبت زندگی کی ایک عظیم حقیقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری باقی شاعری کی طرح کلامِ مہجور کا بھی بیشتر حصہ کیفیاتِ محبت سے متعلق ہے لیکن یہ بات ہمیں اُس کی تنگ دامانی کا احساس نہیں ہونے دیتی۔ اُس کی عشقیہ شاعری میں اس قدر تڑپ، گہرائی اور گیرائی ہے کہ اُس کے تجزیہ سے ہم مہجور اور اُس کے عہد کے متعلق بہت کچھ سمجھ سکتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ایک محبوب کے گیت گاتا رہا، اُس کے فراق سے دکھ اور وصال سے لطف اٹھاتا رہا۔ اور نغمہ ریزی کی دھن میں اپنے جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ اُس کے خد و خال کی بھی تصویریں اُبھارتا رہا۔ کشمیری شاعری کی روایت کے مطابق وہ خطاب کبھی مرد کی زبان سے کرتا ہے اور کبھی عورت کی زبان سے

لیکن محبوب کا تصور ہمیشہ ایک رہا ہے۔ اس قدر غیر مبہم اور واضح کہ ہمیں اُس کے پہچاننے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوتی۔ یہ بات ضرور ہے کہ وہ اپنے عہد کی کیفیات کا مکمل شعور نہیں رکھتا تھا۔ جس کی وجہ سے بعض جگہ ایک تضاد کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

مہجور نے اُس وقت آنکھیں کھولیں، جبکہ صدیوں کی غلامی اور بندگی سے جھلسے ہوئے ویرانے کے خستہ حال مکین، بہار کا ایک مبہم سا خواب دیکھنے لگے تھے کشمیر کی مظلومیت، بغاوت اور انقلاب کے مفہوم سے آشنا ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور ملک کے سیاسی اور سماجی ڈھانچے میں تخریب و تعمیر کا عمل تیز تر ہونے لگا تھا۔ بہار آنے لگتی ہے تو زندگی کا ادراک اور جوانی کا احساس بھی اُبھرنے لگتا ہے۔ مہجور کے محبوب کی سب سے بڑی خصوصیت کسی حد تک اس عمل کی بھی پیداوار ہے۔ اور وہ خصوصیت ہے اُس کا انسان ہونا۔ وہ ہمارے اکثر شعراء کی طرح کسی غیر مرئی محبوب کی بات نہیں کرتا۔ جو "نہ کہیں اوپر ہے نہ کہیں نیچے۔ جس تک ہمارا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا"۔ وہ ہمارے شمس فقیر کی ہمنوائی میں اس الجھن کا بھی شکار نہیں ہوتا کہ "وہ خود ہی عاشق ہے۔ خود ہی معشوق ہے، اور خود ہی سب کچھ ہے"۔ اُس نے رسول میر کی طرح ہمیشہ ایک چلتے پھرتے انسان کا ذکر کیا۔ وہ اپنے محبوب کو نشاط اور شالیمار کے باغوں میں ڈھونڈتا ہے۔ وہ میلے دیکھنے جاتا ہے کہ شاید وہاں دیدارِ یار نصیب ہو۔ وہ جب سنتا ہے کہ اُس کا دوست ڈل کی سیر کرنے جا رہا ہے، تو خود پانی میں کنول بن کر اُس کے درشن کا منتظر رہنے کی خواہش کرتا ہے۔ عشق و محبت کا یہ حیات آمیز تصور مہجور کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ کبھی کبھی ایسی باتیں بھی کرتا ہے کہ "ساز و سامانِ حسن قابلِ تعریف

نہیں۔ اسے مہجور تو مجاز سے فریب نہ کھا"۔ لیکن شعور کی یہ خامی اُس کے سارے کلام میں صرف کہیں کہیں نمایاں ہے۔

مہجور کا یہ زندہ محبوب اس قدر سنگ دل واقع ہوا ہے کہ وُہ ایک بار جب جلوہ دکھا کر اپنے چاہنے والے کو نیم بسمل کرتا ہے، تو پھر آرام کے ساتھ بے نیازی کی زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے عاشق کو عالمِ فراق میں طرح طرح کی مصیبتیں جھیلنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ عاشق موت و حیات کی کشمکش میں پڑھ کر نڈھال ہو جاتا ہے۔ اور تلملا کر اپنے محبوب کو ظالم اور بے وفا کہکر یاد کرتا ہے۔ محبوب کی یہ سنگدلی انتہائی مبالغہ کے ساتھ پیش کی گئی ہے خصوصاً مہجور کے ابتدائی کلام میں۔

بید ردہ جفا کارو، بے عار ستمگارو

یتھہ پھیرو دل آزارو' مو کرزہ دل آزاری

(اے بیدرد، جفا خو' بے رحم، ستمگر اور دل آزار، ذرا لوٹ کے آ اور دل آزاری نہ کر) محبوب کے جفا پیشہ اور سنگدل ہونے کا بار بار ذکر آیا ہے۔ حد یہ ہے کہ ایک بار وُہ اپنے چاہنے والے کو تیر مژگاں سے چھلنی کر کے خود بھاگ جاتا ہے، تو عاشق دیوانہ وار اُس کا تعاقب کرتا ہے، یہاں تک کہ اُس کے پاؤں تھک کر چُور ہو جاتے ہیں اور وُہ پسینہ سے شرابور ہوتا ہے۔

شُمہ بالہ تُھسِم، گمہ گیم جاری یارس پتہ لاٗرِ لاٗری پے

رُوزہ ناساتھا پوزہ میانِ زاری' لگہ یو بال پاٗر پاٗری پے

(میرے پاؤں تھک کر چُور ہو گئے، اور میں پسینہ سے شرابور ہو گئی، اپنے دوست کا پیچھا کرتے کرتے۔ کاش دم بھر ٹھہر کر میری فریاد تو سُن لیتے، تیرے قربان جاؤں میرے دوست!)

اس شعر میں خطاب عورت کی زبان سے ہے اور وہی اپنے محبوب کا پیچھا کرنے میں یہ ستم سہ لیتی ہے۔ محبوب کی سنگدلی کا یہ تصور فراق کی طوالت درد کی شدّت اور شعور کی خامی سے پیدا ہوا ہے۔ فراق کی شدّت اور اُس کے نتیجہ کے طور پر ایک جذباتی ہیجان کا وجود اس سماج کا طرۂ امتیاز تھا جس میں مہجور نے سانس لیا۔ اور شعور کی خامی بھی نتیجہ ہے، اُس درد کا جس میں ہمارا ویرانہ ابھی بہار کا ایک مبہم سا خواب دیکھ رہا تھا۔ کلامِ مہجور میں عاشق (چاہے وُہ مرد ہو یا عورت) اپنی کیفیاتِ محبت کا ذکر کرتے ہوئے اپنے آپ کو انتہائی بےبس اور مجبور ظاہر کرتا ہے۔ ہمارا سماج کچھ ایسی ہی نوعیت کا ہے کہ ہماری ساری رُوحانی شاعری میں عاشق بے چارگی اور مجبوری کا ایک پیکر بن کے رہ گیا ہے۔ مہجور نے بھی اس کی تصویر کشی کی ہے، کمی صرف اسی چیز کی رہ گئی کہ عاشق اپنے محبوب کی بے کسی اور بے بسی کا احساس نہیں رکھتا اور اپنے محبوب کو سنگدل قرار دیتا ہے۔ عاشق کی یہ مجبوریاں وہاں زیادہ واضح ہیں جہاں خطاب عورت کی زبان سے ہو رہا ہے۔

دوریرٕ یارہ سُند چھُم وُدہ ناوان ٹُبکہ ٹبکہ آب زن نزادان چھیس

لُکہ پامہ بدنس زدہ کرناوان پوشن مالہ کرہ ناوان چھیس

ژہ یارن سیت ژھوہ ماران بہ تنہا خُون دل ہاران

دوہس مانیرہ چھس ہتاراں بہ ژھارتَ راتلے بمبرو

کوت نیرہ سیہ سرہ چھس، بے پے بے رہبر چھیس

اندری ہتیتھ لولہ شر چھیس، لولچی چھم بیماری

وُچھمک مر دورہ دور سے، سنہ گوم سوز گچھ خور سے

چھیس ودان ژورہ ژور سے، پوشہ متہ جانانو

(دوست کی جدائی مجھے رُلا رہی ہے۔ میں آنکھوں سے پانی کے دریا بہا رہی ہوں غیروں کے طعنے میرا جسم چھلنی کر رہے ہیں، میں تمہارے لئے پھولوں کے ہار گوندھ رہی ہوں۔)

(تم دوستوں کی محفلوں میں مزے لوٹ رہے ہو، اور میں اکیلی خُون کے آنسو بہا رہی ہوں۔ دن کو نکلتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے۔ اے میرے بھونرے میں تجھے رات کے وقت ڈھونڈ لونگی)

(میں کہاں نکلوں گی۔ میں نورہ رسم محبت سے ناآشنا ایک عورت ہوں میں دل ہی دل میں درد محبت پال رہی ہوں۔ مجھے محبت کا روگ لگا ہے۔)

(میں نے تجھے دور ہی سے دیکھ لیا۔ اور میں جنت کی حور نیم بسمل ہو گئی۔ اب میں چھپ چھپ کے رو رہی ہوں۔ اے پھولوں کے متوالے میرے ساجن!)

ان اشعار میں بے بسی کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ ہمیں سماجی اسباب کا شعور ہوتا ہے جن کی وجہ سے یہ نیاست بپا ہے۔ جہاں عاشق مرد ہے وہاں بے بسی کا ذکر تو ہے۔ مگر اس میں ماحول کا جو حصہ ہے اُسے واضح نہیں کیا گیا ہے۔ مجبوری کا بیان کچھ اس طرح سے ہوا ہے جیسے وُہ محبوب کی سنگدلی ہی سے پیدا ہوئی ہو۔ اگر دونوں صورتوں میں محبوب کی سنگدلی کی بجائے اُسکی بے بسی کا ذکر عاشق کی زبان سے ہوتا، تو فراق کو پیدا کرنے والے سماجی اسباب

کے خلاف بغاوت کا جذبہ جاندار ہوتا۔

محبوب کا تصور زندگی کی جدوجہد میں عاشق کی رگوں میں لہو کی گردش تیز کرتا ہے، اُس کے جذبۂ عمل کو اُبھارتا ہے، زندگی کی تلخیوں کا احساس گھٹاتا ہے، قوت اور ہمت میں اضافہ کرتا ہے اور اس طرح یاس اور فرار کے بدلے جدوجہد پر آمادہ کرتا ہے۔ مہجور اس حقیقت سے آگاہ ہے۔

بیپارہ بو سرہ تارہ گمژ داو وچھت ناو
طوفانہ منزہ الخہ ناوہ اپور تارہ محبت

(میری کشتی باد طوفان دیکھ کر دریا کے اس پار ہی ایک اُلجھن میں پڑ گئی، محبت ہی اس طوفان میں اس کو پار کر سکتا ہے)

وہ جانتا ہے کہ اگر محبوب کا وصال ہو تو عشق سے معجزوں کی نمود ہوتی ہے۔

یم زہ[۲] یود باہم رلن ادہ کوہ الن سنگر ڈلن
دردہ ہیتھ میانن آلو، ساز تہ سامانہ چون

(اگر عشق کی آہ و فغاں اور حسن کا ساز و سامان مل جائیں تو پہاڑ ہلائے جا سکتے ہیں۔)

محبوب کا یہ تصور مہجور سے پہلے کے شعرا میں اس صورت میں نا پید ہے، سوز و سازِ حیات کا یہ نغمہ خواں ان رموز کی چہرہ کشائی جس سادگی اور شان سے کرتا ہے، وہ اُسی کا حصہ ہے، یہ اُس کے صحت مند تصور کا معجزہ ہے کہ اُس نے جمالِ جاناں اور جلالِ عاشق کی ہمنوائی کو ایک انقلابی قوت اور ایک طوفانی طاقت کی حیثیت سے پہچان لیا۔ اور اس کا ذکر اُس رجائی اور اُمید افزا انداز سے کیا جو دلکش اور دل افروز ہے۔ اس کے کلام کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ تصور عمر کی رفتار اور تجربات کی وسعت کے ساتھ گہرا ہوتا گیا۔ وہ محبوب کی سنگدلی کی شکایت بھی کرتا ہے اور عاشق کی مجبوریوں کا ذکر بھی۔ کارزارِ محبت میں کئی بار اپنی جان بھی خطرہ میں پاتا ہے لیکن اس آزمائش دار و رسن میں اُس کے قدم لڑکھڑاتے نہیں بلکہ وہ اِسے زندگی کی قوتوں کو بروئے کار لانے کا سامان سمجھتا ہے۔

لولہ نار پانس گنڈ لم میرہ بون امہِ نارہ سرتلہ سپنم سون
ولیسہ کیا زہ آسم ولیسہ راوان مارہ منترِ وارہ وتہ لاگ میون پان

(میرا سارا جسم آتشِ محبت سے جھلس گیا اور اس آگ سے میری کانسی سونا بن گئی

میری سہیلیاں مجھے کیوں ڈراتی تھیں۔ میرے محبوب میری زندگی ٹھکانے لگا۔)

کلامِ مہجور میں عاشق جب مرد ہوتا ہے تو وہ اپنے محبوب کے گرد شہیدانِ ناز کا جھرمٹ دیکھ کر گھبراتا نہیں، وہ اس کو حسنِ محبوب کا ثبوت سمجھتا ہے اور اس لئے اسکا ذکر فخر سے کرتا ہے۔ رقیب کا خیال اُس کے دائرہ فکر سے باہر ہے، وہ محبوب کی جُدائی کے لئے اسکی بے نیازی، عشوہ کاری اور ناز و ادا کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ برعکس اس کے عاشق جب عورت ہوتی ہے تو اپنی غم نصیبی میں اپنے محبوب کی سنگدلی کے ساتھ ساتھ رقیب روسیاہ کی کار فرمائیاں بھی تاڑ لیتی ہے، یہ بات اسلئے پیدا ہوئی ہے کہ جاگیردارانہ سماج میں عورت مرد کے مقابلہ میں زیادہ تشنۂ محبت اور زیادہ مظلوم و مجبور ہوتی ہے اس کے غم خانہ میں ایک کرن کا بھی گزر ہو، تو وہ ساری کائنات کو اپنا رقیب سمجھ لیتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ شاید فطرت کی ساری قوتیں اس کی یہ متاعِ حیات چھین لینے کی کوشش میں ہیں۔ مرد کی مظلومیت اتنی نمایاں نہیں ہوتی اسی لئے وہ بار بار اپنے محبوب سے سوال کرتی ہے کہ یہ مجھ سے حسین کون ہے جو تمہیں مجھ سے جُدا کر گیا۔

ژہ کس ییتی گئے سازش دوئم چھا بیا کھ کانہہ مہ ہاش
ژہ میانے رنشکہ پانن کش ادگھ کمہ مسولے ممبرؔ

(تمہیں کس کے حسن نے مجھ سے چھین لیا۔ کیا کوئی اور بھی مجھ جیسی ہے اسے میرے بھونرے! تمہیں کس گلبدن نے میرے رشک سے اپنے پاس ٹھہرا لیا)

لگمت تس چھ پرس کیاہ تام میون ونہ ہس
نتہ ونتہ بے سبب تس چشمن خمار آسیا

(وہ پرائی شراب سے مست ہو گیا۔ میرے متعلق اُسے نہ جانے کیا کیا کہا گیا ہے ورنہ آخر بے وجہ اُس کی آنکھیں مخمور کیوں ہوتیں۔)

منجملہ ان چند باتوں کے جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ مہجور کے کلام میں خطاب مرد کی طرف سے ہو یا عورت کی طرف سے، تصورِ محبوب میں بہت حد تک یکسانیت ہے۔ دونوں صورتوں میں جب محبوب کے حسن کی تعریف ہوتی ہے تو جسم کے خد و خال ایک جیسے بیان ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے کمند، گیسو، خالِ سیاہ، محرابِ ابرو، تیرِ مژگاں، نرگسی آنکھوں اور تلوار جیسی ناک کی تعریف کرتے ہیں۔ اس طرح کہ صرف حسن کی تعریف سن کر محبوب کے مرد یا عورت ہونے کے متعلق رائے قائم کرنی مشکل ہوتی ہے۔

جس کائنات سے ہماری دلچسپی تصوّر محبوب کے تابع رہتی ہے ہمارے حواس پر محبوب کا حُسن کچھ ایسا جادُو کرتا ہے کہ وہ ہمیں ساری کائنات سے زیادہ حسین معلوم ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ زندگی کی یہ ساری رنگ و دو وجود یار کی منّت کش ہے۔ گلاب کی پنکھڑی دیکھتے ہیں تو اُن کے لب نازک کی یاد آتی ہے۔ شفق کی لالی سے رُخسار کی سُرخی کا تصوّر آتا ہے۔ کالی گھٹاؤں سے زُلفِ یار کا خیال آتا ہے۔ گلزارِ حُسن خوباں کے ہر پھول سے خوشبوئے یار آتی ہے صبا کے جھونکوں کی سرسراہٹ اور پھولوں کی پتیوں کی لرزش میں ان کا اشارہ ملتا ہے۔ خورشید کی مشعل چمکتی ہے، تو اُن کی پیشانی جھلکتی معلوم ہوتی ہے۔ ان جذبات کا اظہار مہجور کے الفاظ میں سُنیئے۔

دارہ ہند پوش، بنبر زل، گل نہ سنبل، مسول
وارہ پیتھ دارہ لگان، چھ ژہ یاری یاری
برم چھ کینژن تہ چھ کینہہ مست گٔت کینہہ ہُشیار
فتنہ کرٔ پیدا امی چشم خماری ساری

(پھلواڑی کے پھول۔ نرگس، گلاب، سُنبل اور یاسمن سب باری باری تیری بھینٹ چڑھ رہے ہیں۔ کچھ لوگ برماگئے ہیں۔ کچھ مست ہیں اور کچھ بیدار ہیں۔ یہ سارے فتنے تیرے خمارِ چشم کے پیدا کئے ہوئے)

عاشق کی بے بسی اور معشوق کی سنگ دلی کے باوجود مہجور کا نظریۂ عشق معصومیت، سادگی، دلکشی، حیات آفرینی، اثر انگیزی اور رجائیت سے لبریز ہے۔ اور اس کا فیصلہ ہے۔

لٔا ناون ژھایہ تھاون زاہ نہ کرتراون یہ لول
پوشہ کھوتہ چھم زیادہ آدُل، جانہ کھوتہ بیشٔر ملول

(میں اس محبت کی پرورش کروں گا، اس کو پاس رکھوں گا، اور کبھی اپنے سے جُدا نہیں کرونگا۔ یہ پھُول سے زیادہ نازک اور جان سے زیادہ گراں قیمت ہے)

مہجور نمبر میں بچوں کے صفحات کے لیۓ گنجائش نہ نکل سکی۔ بچوں کے لئے ایک الگ رسالے کے اجراء کی تجویز زیر غور ہے ●

انتباہ

شری مینن نے دھلی کے روٹری کلب میں ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "کشمیر کے متعلق ہندوستان کے روّیہ کو غلط سمجھنا بین الاقوامی اخلاق کے لیئے ایک چیلنج ہے۔ ہندوستان ایک صلح جو ملک ہے، طاقت سے بات منوانے کا یہ قائل نہیں۔ لیکن اس کی اس خواہش کا ہرگز یہ مطلب نہیں لینا چاہیئے کہ ہندوستان کمزور ہے یا جابرانہ قوتوں کے سامنے اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔

اس جلسہ میں سرکردہ سیاستدانوں کے علاوہ دہلی میں غیر ملکی سفارتی نمائندے بھی موجود تھے۔ اس میں شری مینن نے بین الاقوامی حالات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا، جس میں زیادہ تر کشمیر کا ذکر تھا۔ آپ نے کہا کہ بعض لوگوں نے حق خود ارادیت کے معنی بھی نہیں سمجھے ہیں۔ اگر اس لفظ کا غلط استعمال کیا جائے تو اس سے ہندوستان خوف زدہ نہیں ہوسکتا۔ حق خود ارادیت قوموں کو حاصل ہوتا ہے، وہ اُن کی سرداری اور اختیار اعلیٰ کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر آج ہندوستان کے ہر ایک حصے کو حق خود ارادیت دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے ملک کا بلقان کی ریاستوں کی طرح شیرازہ بکھر جائے گا۔ لیکن ہم ایسا کوئی بھی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں جس سے ہماری قومی یکجہتی اور سالمیت کے حصے بخرے ہو جائیں

شری مینن نے کہا کہ اقوام متحدہ میں کشمیر کے متعلق ہمارا موقف یہ تھا کہ کسی بھی ملک کو جابرانہ کاروائی کے لئے پھل پانے کا حق نہیں ملنا چاہیئے۔ چہ جائیکہ یہ جابرانہ کاروائی سویز نہر کے سوال پر ہوئی ہو یا گلگت کے سوال پر جابرانہ حملہ کے سامنے جھکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک بار اگر جابر کے سامنے ہتھیار ڈال دئے جائیں تو پھر نہیں کہا جاسکتا کہ جارحانہ کاروائی کا یہ طوفان کہاں جاکر تھم جائے۔ شری مینن نے کہا کہ سلامتی کونسل میں بھی ہم نے یہ بات واضح کردی کہ کشمیر ہندوستان کا حصہ ہے۔ اس پر ہندوستان کے ایک حصہ کے طور پر حملہ ہوا ہے۔ اب اگر پاکستانی فوجوں نے خود یا کسی دوسرے کی شہ پر جنگ بندی سرحد پر حملہ کرنے کی کوشش کی، تو اس کا مقابلہ کرنے کے لئے سارا ہندوستان اُٹھ کھڑا ہوگا۔ اور ایک ایک ہندوستان کشمیر کا بچاؤ کریگا۔ آپ نے کہا کہ جب کشمیر پہ جابرانہ حملہ ہوا تو اسوقت کشمیری عوام ہی مزاحمت کرنے اُٹھے۔

حبیب اللہ حامدی

مہجور کی شاعری میں حب الوطنی

عشق اور تصوّف — یہ ہیں دو مخصوص اور نمایاں موضوعات، جن پر بیسویں صدی کے ابتدائی اور وسطی دور تک کا کشمیری شعر و ادب مشتمل ہے۔ یہی دو موضوعات ہیں، جن پر حبہ خاتون سے لے کر محمود گامی تک ہر شاعر نے خامہ فرسائی کی۔ اور اپنے دائرہ فکر و نظر کو ان ہی روایتی حدوں تک محدود رکھا یہ ٹھیک ہے کہ ہر بڑے قادر الکلام شاعر نے اپنے داخلی تجربات اور احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے ان پرانے موضوعات میں تنوّع، وسعت اور جدّت پیدا کی۔ رسول میر نے عاشقانہ شاعری میں سوز و ساز، رعنائی، تازگی اور موسیقی کے حسین امتزاج سے ایسے پرکیف نغموں کی تخلیق کی۔ جو ہمارے دل کی وادیوں میں رنگ و نور کی جھلملاہٹیں بکھیر دیتے ہیں صوفی شعرا میں شمس فقیر اور احمد بٹواری نے رنگارنگ فکری اور روحانی تجربات کو دلکش اور شیریں لے میں پیش کر کے دل کے خاموش تاروں کو مرتعش کر دیا۔ اور اسی طرح شاعری کے دامن فکر و تخیّل پر رنگارنگ نقوش اُبھرتے رہے لیکن اس کے باوجود شاعری ابھی اس دوران میں پروان چڑھ رہی تھی جب شاعر محض حسین خواب زاروں کے طلسم کو حقیقت سمجھ بیٹھے تھے۔ اور اُنہیں اس بات کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ حقائق زمانہ کی ٹھوس چٹانوں کی حدّت کے سامنے خوابوں کے شیش محل پگھل کر رہ جاتے ہیں۔ وہ دن رات انہیں خوابوں کے حسین جال بُنتے رہتے اور اُنہیں فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ حیات و کائنات کی گوناگوں حقیقتوں کی طرف نگاہ اُٹھا لیتے، اُن کی عقدہ کشائی کرتے، زندگی اور سماج کے گھناؤنے پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتے۔ اپنی وادی کی فردوس بداماں بہاروں کا نظارہ کرتے — یہ ایک ایسا دور تھا، جب زندگی پر جمود، مردنی اور بے حسی مسلّط تھی ایک ایسا دور، جب فکری صلاحیتوں کے آئینے زنگ آلود ہو جاتے ہیں صدیوں کی غلامی، جہالت اور مُفلسی نے ذہن انسانی کو خواب اجل سے ہمکنار کیا تھا اور شاعر بھلا اس خواب اور کیفیت سے کہاں بچ کر جاتے ؟ وہ کبھی عشق اور کبھی تصوّف کی حسین اور سکون پرور وادیوں میں پناہ ڈھونڈتے رہے

بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں دنیا نے ایک نئی کروٹ بدلی۔ دنیا کی خوابیدہ قوموں میں بیداری، حرکت اور عزم و عمل کی ایک تیز لہر دوڑ گئی اس آفاقی تغیّر نے اہل کشمیر کے لہو میں بھی گرمی اور حرکت پیدا کر دی۔ ان کے دلوں میں سوز یقین کے چراغ جل اُٹھے، اور غلامی کی کہنہ زنجیریں توڑنے کے لئے اُن میں اپنی بکھری ہوئی قوتوں کو مجتمع کرنے کا شعور جاگنے لگا۔ یہی وہ وقت ہے جب کہ کشمیریوں کا محبوب شاعر مہجور ایک حقیقی محبّ وطن کے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے اور بڑی خوش اسلوبی، تن دہی اور کامیابی کے ساتھ اپنا حصہ ادا کرتا ہے۔ آپ نے اپنے دامانِ فکر میں رسول میر کے عاشقانہ جذبات کے قوس قزح کو بھی اُبھارا۔ اور ساتھ ہی اپنے ماحول اور گرد و پیش کے حالات اور وقت کے اہم تقاضوں کا ساتھ دیا۔

مہجور نے جب زندگی کا مشاہدہ کیا۔ اُس کی نگاہ شوق کو زندگی کی واردات، اس کے بانکپن اور رعنائی نے اتنا مسحور کر لیا کہ اُسے خیالی معشوقہ کے حسن نظر فریب کے کھوکھلے پن کا شدید احساس ہوا۔ آپ نے اپنے دل کو روایتی محبوبہ کی زُلف پیچاں سے خلاصی دلانے کی ضرورت شدّت سے محسوس کی۔

نیرانہ گژھ نِشہ نیر آ گرژہ حسنک سرہ کر
کوتہ کالاہ بند روزکھ زلفِ پیچانس اندر

(ظلمتوں سے باہر نکل آ، اور حُسن کے منبع کو دیکھ لے۔ کتنی دیر تو زلفِ پیچاں میں مقید رہے گا۔)

اپنے لئے ایک خاص راستہ متعین کرنے کے بعد آپ کے سامنے

ایک اہم فریضہ یہ تھا کہ آپ اپنے ہموطنوں کو صدیوں کے خوابِ غفلت سے بیدار کریں -

مہجورؔ ژہ تہ بن سونتک واو   روشہ روشہ باغس کُن قدم تراوُ
ژہ نہ گرتھ سندرہت وزہ ناوان   مارہ متہ وارہ ونہ لاگ میون پاَن

(مہجور تو بھی نسیم بہار بن کر دھیرے دھیرے چمن کی سمت قدم اُٹھالے، اور سوئے ہوؤں کو جگالے)

مہجورؔ ایک حقیقی محبِّ وطن تھا - اُس کی روح جذبۂ حُبُ الوطنی سے سرشار تھی - اُسے اپنے مقدس وطن کے ذرّے ذرّے سے پیار تھا، ان کے شعور کو وطن کے والہانہ پیار نے نکھار بخشا تھا — پیار کا ایک بے پناہ جذبہ جو چھپائے سے چھُپ نہیں سکتا -

پوشیدہ تھاوُ تھاوُ دراوُ بھیٹحہ میون حال
یتھہ پاُلٹھ پوشس سینہ ژٹت مُشک نیر دراوُ

(پوشیدہ رکھنے کی پیہم کوشش کے باوجود بھی میرا حالِ دِل آشکارا ہو گیا، جس طرح پھول کا سینہ چاک کر کے خوشبو باہر نکلتی ہے)

مہجورؔ کا اپنا دل حبُّ الوطنی کے بادہ سہ آتشہ سے سرمست تھا، آپ کی دِلی خواہش تھی کہ عام لوگ بھی اسی مقدس جذبہ سے سرشار ہوں

بوزم چھہ ساقی باگراوان یٰتھہ وطنکُ مس
تمہ شوقہ نوی کھاس نوی بانہ بناوِم

(میں نے سُنا کہ ساقی حُب الوطنی کی شراب تقسیم کر رہا ہے - میں نے اس کے لئے نئے برتن اور نئے جام بنا دئیے -)

چھہ مہجورؔ مس بھران کھاسن بہ لو لک مس چھوُ سارن چُن
دیان بنن نہ بیہ پرُدن یوہے مس باگراون چھُم

(مہجورؔ جام میں شراب ڈال رہا ہے اور محبت کی یہ شراب سبوں کو پینی ہے یہ شراب اپنے اور پرائے سب لوگوں میں مساوی طور پر تقسیم کرنی ہے)

کشمیری شعر و ادب میں مہجورؔ پہلا عظیم فنکار ہے جس نے خیالوں کی طلسمی دنیا میں بھٹکنا خود فریبی کے مترادف سمجھا - آپ نے نگاہ شوق وا کی - آپ کی نگاہیں وادی کی بے پناہ رنگینیوں اور رعنائیوں میں کھو گئیں آپ کو قدم قدم پر فطرت کی بوقلمونی اور بہاروں کے بدلتے ہوئے حسین اور شوخ رنگوں کی فراوانی نظر آئی - نقرئی آبشاروں کے سوز و ساز نے اور لہراتی ہوئی جوئباروں کی موسیقی نے آپ کے سازِ دل کے تاروں میں آگ بھر دی - آپ کا احساس جمال کروٹیں لینے لگے گا - اور نغمات مسرت شعروں میں ڈھل کر بکھرنے لگیں گے" بہار" میں آمد بہار کی تصویر ملاحظہ ہو -

دل تنبہ لاوان جلوہ ہاوان آکھا بہارو یمشہ راوُمت کتھہ یاد ہاوان آکھا بہارو
بخشت ژہ آرن آبشارن دردہ سوزک ساز - افسانہ لولک ونہ ناوان آکھا بہارو
گل چاک جامن داوہ ناو تھ بادہ ناو تھ حال - دل بلبلن ہند تنبہ لاوان آکھا بہارو

(اے بہار تو نے اپنے جلوے دکھا کر ہمارے دلوں کو بے قابو کر دیا، تو کیا آئی بھولی بسری باتیں یاد آگئیں -)

(تو نے جوئباروں اور آبشاروں کو سوز و درد کا ساز عطا کیا - تیری آمد پر محبت کے افسانے بیان کئے جا رہے ہیں -)

(پھولوں نے اپنے لباس کو تار تار کر دیا - اور اس طرح اپنا حال ظاہر کیا - تو نے بلبلوں کے دلوں کو بے قرار کر دیا -) ×

مہجورؔ حسن فطرت کا شیدائی تھا - اس والہانہ جذبہ نے آپ کو وادی کے حسین مقامات اور پوشیدہ گوشوں میں دیوانہ وار پھرایا - جہاں بھی آپ پہنچ گئے، آپ کا دل "جا اینجاست" کہتا رہا - ایک غزل میں وہ اپنی محبوبہ کو وادی کے دلکش مقاموں کو دیکھنے کی پوری دعوت دیتا ہے۔

سیلہ متہ سی ڈونگہ بیراوس   میلہ وچھنے نمن اچھہ وِل
یوس مرگہ ہند سبزار ہاوس   دتھ راوس فرش مخمل
نیلہ ناگچہ گلہ بولہ ناوس   سرتراوس پاوَن تل

(اپنے سیلانی دوست کے لئے میں ایک ڈونگہ سجاؤنگا - اور اس کو اچھہ بل کے میلہ پر لے جاؤنگا)

(میں اس کو یوس مرگ کا سبزہ زار دکھاؤنگا - اس کے قدموں میں فرش مخمل بچھاؤنگا - میں اس کو نیلہ ناگ کے پرندوں کے گانے سناؤں گا -)

اور اسی طرح سنگرون، ناگر بل، سندھ بٹھ، مانسبل، زوڈر، نیل بل، نشاط و شالیمار کے حسن نظر نواز کی عکاسی اشاروں اشاروں ہی میں کرتے ہیں: مہجورؔ کا شعور وادی کی رنگین بہاروں اور شاداب مرغزاروں میں نکھار حاصل کر چکا تھا - اس لئے آپ کو وادی کے چپے چپے سے پیار تھا - پیار کا یہ مقدس جذبہ آپ کی نظموں اور غزلوں کے پیمانوں سے چھلکتا ہے - آپکی نظمیں پڑھ کر ہمیں بھی حبُّ الوطنی کے لطیف احساس کی سرمستی کا احساس

ہونے لگتا ہے۔ ہمارا دل وادی کی بہاروں کے لئے ایک انجانے احساس تپش کے تحت دھڑکنے لگتے ہیں۔ کیا یہ محبوب کے جذبۂ حب الوطنی کا ایک روشن ثبوت نہیں؟

مہجور کو منظر نگاری میں بھی کمال حاصل تھا۔ آپ سے پہلے کشمیری شاعری میں منظر نگاری کا پہلو تقریباً مفقود تھا۔ "گلریز" میں مقبول شاہ کرالہ واری نے کہیں کہیں منظر کشی کے چند مختصر نمونے پیش کر دئے ہیں۔ لیکن مہجور کی منظر نگاری میں ہمیں ایک جمالیاتی شعور کی دھڑکنیں محسوس ہوتی ہیں۔ جو ہمیں بالکل ایک نئے احساساتی تجربہ سے روشناس کراتی ہیں۔ ہماری نگاہوں میں موسیقی رنگ اور نور کا ایک سماں بندھ جاتا ہے۔

اند اند سفید سنگر دیوار سنگ مرمر
منز باگ سبز گوہر گلشن وطن چھے ینوی

(اردگرد پہاڑوں کی سفید چوٹیاں ہیں جیسے سنگ مرمر کی ایک دیوار ہے۔ بیچ میں گوہر نما سبزہ زار ہے۔ ہمارا وطن جنت ہے)

آپ کسی حسین منظر کے نقوش ابھارنے کیلئے نئی تشبیہیں اور استعارے تخلیق کرنے پر بھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ مہجور کو واقعی شاعرانہ زبان و بیان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ ایک شعر ہے۔

سونتھ یلہ آو باغ پھول ول جام خُشک گلشنو
نوبہار چہ سازگرہ پیراو پھرینہ شیقہ سان

(جب بہار آگئی چمن کھل اٹھا۔ چمن زاروں نے حسین لباس پہن لئے۔ بہار نو نے بڑے ذوق و شوق سے پھولوں کی دلہنوں کو سجایا۔)

حسن فطرت کی رعنائیوں کا نظارہ کرتے وقت جب آپ کی نگاہ حقیقت کش اہل گلشن کے دروں سے پردے سرکا دیتی ہے تو آپ کو مظلوم دلوں کی زخمکاری نظر آتی ہے۔ آپ کی نگاہیں غلامی، جہالت اور مفلسی کے پرہول اندھیروں میں بھٹک جاتی ہیں۔ آپ کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ طبقاتی اونچ نیچ دیکھکر آپ کی روح انگاروں پر لوٹتی ہے اور آپ کی مجروح پکاریں بلند ہوتی ہے۔

تس ہام بیمژ آوہ سیمژ لبہ آمژ تن زینہ ساتہ پیٹھ از تام رودی لُس ژہ خدمتگار

(اس کے زخم متعفن ہو چکے ہیں۔ اس کا جسم سڑا ہوا ہے، وہی جو پیدائش سے لیکر آج تک تیری خدمت کرتا رہا۔)

پننن چھو ارمان غیرتے بیگانہ چھاوان باغ

من خوش چھ نھاوان تن چھی ناوان سندہ ڈلن منز

(اپنوں کو حسرت ہے۔ اغیار اور بیگانے گلشن سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ دلوں کو مسرور رکھتے ہیں۔ اور بہتے ہوئے دریاؤں سے نہاتے ہیں۔)

"نالۂ کشمیر" میں روح کشمیر فریاد کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

سنبہ لاوان پوشہ نولن گلزار مین سنبہ لاوان راومت دل آبشار سبزار مین
عالمک بیمار گھرہ میون آی واپس بلتھ ترشہ ہت پمیت ژن پٹھ زوُ دوان بیمار مین

(میرے دل پوشہ نول اور بلبلوں کے دل بیقرار کرتے ہیں۔ میرے آبشار اور سبزہ زار بیقرار دلوں کو قرار بخشتے ہیں۔ دنیا بھر کے مریض میرے گھر آئے اور صحت مند ہوکر چلے گئے، لیکن میرے بیمار تشنگی کی حالت میں سڑکوں پر جان دیتے ہیں)

لیکن مہجور اہل وطن کی (؟) دلدوز حالت دیکھکر صرف آہیں بھرنے پر اکتفا نہیں کرتے۔ وہ ایک حقیقی محب وطن کی طرح انہیں سمجھاتے ہیں کہ وہ غلام ہیں۔ وہ ان کے مردہ دلوں میں عزم و یقین کے شعلے بھڑکانا چاہتے ہیں۔ انکی قومی خودی کو زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ انقلاب چاہتا ہے۔ انقلاب ۔۔۔ ایسا انقلاب جو محض کھوکھلی نعرہ بازی کا حاصل نہیں، ایسا انقلاب جو اسکی قوم کی تقدیر بدل دے۔ انقلاب کی اس آواز میں عالمگیریت ہے، بغاوت ہے اعتماد ہے اور سوز یقین ہے ؎

ولو ہا باغوانو نوبہارک شان پیدا کر پھلن گل گت کرن بلبل تھوی سامان پیدا کر
اگر وزہ ناو مین ستی گلن ہندزا وزیر دیم بُتل کر واو کر گگرایہ کر۔ طوفان پیدا کر

(اے مالی اٹھ اور نئی بہار کی شان پیدا کر۔ تو ایسے سامان پیدا کر جن سے پھول کھل اٹھیں اور بلبل جھوم اٹھیں، اگر تو اپنے پھولوں کے وطن کو جگانا چاہتا ہے تو زیر و بم چھوڑ دے۔ تو زلزلے بجلیاں اور آندھی اور طوفان پیدا کر)

ایک دوسری نظم میں فرماتے ہیں۔

ولولہ جوش حباب اضطراب ہمت پیدہ گژھہ یامت دلن اندر تہ سی گو انقلاب

(ولولہ، جوش، حباب، اضطراب اور ہمت۔ جب یہ چیزیں دلوں میں پیدا ہو جائیں تو انقلاب جنم لیتا ہے)

مہجور حد درجہ رجائی واقع ہوا ہے۔ چھائے ہوئے گھمبیر اندھیروں میں آپ نے افق حیات پر نئے نویلے اجالوں کی ایک دوشیزہ انگڑائی دیکھ لی تھی۔ آپ کو یقین کامل ہے کہ ظلم و ستم کا شیرازہ عنقریب پریشان ہو جائیگا اور آرزوؤں کے چمن زار میں بہار مسکرائے گی۔

وتھ نظر کر گاش آو کھوت انقلابکُ آفتاب
چون دُمت باغ پھولہ پیغام ہتھ آوُ نوبہار

(اُٹھ دیکھ لے، سحر ہوگئی، انقلاب کا آفتاب نمودار ہوگیا۔ بہار یہ پیغام لے کر آگئی کہ تیرا جلا ہوا باغ اب کھِل اُٹھے گا۔)

مہجور کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ فاقہ مست عوام کے بغاوت پر آمادہ ہونے پر ظلم وستم کی زبردست آندھیاں چلیں گی۔ لیکن آپ کے دل میں اُمید ویقین کی شمعیں برابر جلتی رہیں۔

ہر دُک طوفان پوشہ نقرہ ژالن   سونتھ بیہ دوہہ اکہ تو لہ برخاشس
سوی پھولہ تن یس دِیہ جنجالن   سنگرمالن بیہ پراگاشس

(پھولوں کی ٹہنیاں خزاں کی آندھیاں برداشت کریں گی۔ بہار ایک دن آئیگی تو تحقیقات کریگی۔ وہی کھِل جائے گا جو مصائب کو سہار ے۔ پہاڑ کی چوٹیوں پر نئی سحر کے اجالے مسکرائے۔)

آپ کو معلوم ہے کہ اپنے مشترکہ مقصد کے حصول کے لئے اتحاد، برادری اور یک جہتی کی کتنی ضرورت ہے، اس کا درس اپنے ہم وطنوں کو یوں دیتے ہیں۔

نیاہی تراوِ ماہی تھاوِ پانہ وانِ   پزمحبت باگراوِ پانہ وانِ
غیر نقصان کرنہ نہند س عزتس   یتھ نہ زانہہ عزت ہراوِ پانٹہ وانِ
ملہ ژارک دِت بہ مہجورن سبق   یاد تھاوِ بوزہ ناوِ پانہ وانِ

آخر وہ دن بھی آ ہی گیا، جبکہ ظلم وستم اور مطلق العنانیت کی ظلمتوں کا سینہ چاک ہوا۔ اور آفتاب آزادی جلوہ بار ہوا۔ شاعر کہتا ہے۔

نِہہ گٹہ گوس بیدار کنن کنجہ بولن گوم
زونم مے وندہ سوریو پرتو تراو سونتہ کالن

(میں گجر دم بیدار ہوگیا۔ اور میرے کانوں میں کوئل کی آواز آگئی۔ میں نے جان لیا کہ زمستان گذر گیا۔ اور فصل بہار کا پرتو چھا گیا ہے۔)

آزادی میں لکھتے ہیں۔

بلبلا آزاد گژھنس چاؤ بر   پوشن کراو کر چھاوُ گلزار
پنجرس کر سلام نیرا مہ نشہ نبر   پوشن کراو کر چھاوُ گلزار

(اے بلبل! آزاد ہونے پر ناز کر، پھولوں سے کھیل لے اور گلشن سے لطف اندوز ہوجا، دام کو اب سلام کر، اور اس سے باہر نکل آ)

مہجور کے جذبہ حب الوطنی کا اس بات سے اچھی طرح اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ نے اپنی قومی زبان کشمیری کو فروغ دینے کی حتی الامکان کوشش کی۔ آپ نے نئے اور اچھے خیالات، نئے نئے موضوعات اور ساتھ ہی دلکش تشبیہیں اور استعارے پیش کرکے کشمیری زبان کو وسعت اور بالیدگی عطا کی۔ مہجور کی زبان بڑی شستہ، شیریں اور عام فہم ہے (مہجور عوام کا شاعر ہے آپ کی آواز میں لوگوں کے دھڑکتے ہوئے دلوں کی آواز ہے۔ آپ کی غزلیں کھیتوں میں کام کرنے والے کسان، ملوں میں کام کرتے ہوئے مزدور اور محنت کش اور حسین دوشیزائیں وجدانی کیفیت میں گاتی ہیں ـــ گاتی ہیں اور جھومتی ہیں)۔

خراجِ عقیدت

سرینگر میں ۱۱ اپریل ۱۹۵۲ء کو حضرت مہجور کاشمیری کے جنازہ کا شاندار جلوس نکالا گیا۔ جس میں شہر اور مضافات سے آئے ہوئے بہت سے عقیدت مندوں نے شرکت کی۔ پولیس، ملیشیا، ہوم گارڈ اور پیس بریگیڈز کے جوان بھی اس جلوس میں شامل تھے۔ مہجور صاحب کا جنازہ صبح کو متری گام (پلوامہ) میں پھولوں سے سجائی گئی ایک گاڑی میں سرینگر لاکر خانقاہ معلیٰ میں پہنچایا گیا۔ عوام کا ایک جم غفیر یہاں پہلے ہی موجود تھا۔ تین بجے بعد دوپہر نماز جنازہ ادا کرنے کی رسم انجام دی گئی جس میں جناب بخشی غلام محمد، کابینہ کے دیگر وزراء آئین ساز اسمبلی کے ممبران اور آل جموں وکشمیر نیشنل کانفرنس کے ممتاز ممبروں نے حصہ لیا۔ ماتمی جلوس تین بجے خانقاہ معلےٰ سے روانہ ہوا۔ اس کے آگے ایک گاڑی میں مہجور کا جنازہ رکھا گیا تھا۔ گاڑی میں مرحوم کے صاحبزادہ مسٹر محمد امین اور ان کے کچھ رشتہ دار بیٹھے تھے۔ ماتمی جلوس خانقاہ معلےٰ سے نکل کر فتح کدل، حبہ کدل، گنپت یار، گاؤ کدل اور مائسمہ سے ہوتا ہوا لال چوک میں پہنچا۔ راستے میں ہزاروں لوگوں نے دورویہ کھڑے ہوکر شاعر اعظم کو خاموشی سے خراج عقیدت پیش کیا۔ لال چوک میں پہنچکر نیشنل ملیشیا کے ایک دستہ نے جنازہ کو سلامی دی۔ تھوڑے وقفہ کے بعد لال چوک سے ماتمی جلوس اِنفہ واجن کی طرف روانہ ہوا۔ جلوس کے آگے آگے مہجور کا جنازہ اور بعد میں ٹرانسپورٹ کی بیسیوں گاڑیوں میں عام لوگ بیٹھے ہوئے تھے

(خدمت، سرینگر۔ ۱۲ اپریل ۱۹۵۲ء)

میکدہ

قیصر قلندر

مہجور کی شاعری!

نغموں میں تاروں کی چمک
کلیوں کی دوشیزہ چٹک
کرنوں کی نورانی اُمنگ
ہرنوں کی ہے دلکش ترنگ
جھرنوں کی گاتی چاندنی
شمعِ وطن کی روشنی
کیفیتِ صہبائے غم
اور دیدۂ شبنم کا نم
ہے انجمِ شب کا خیال
مہرِ منور کا جلال
غم ہائے دوراں کی خلش
اور جانِ جاناں کی خلش
وہ دردِ سوزِ آدمی
اور جہدِ پیہم، زندگی
رقصاں ہواؤں کا سُرور
پہنچائے نغمے نزد و دُور
مہجور کی یہ شاعری
جزویست از پیغمبری

کشن سمیلپوری

آہ مہجور!

آہ اے مہجور، کشمیری ادب کے تاجدار
بلبلِ شیریں نوا، اے شاعرِ عالی وقار
اے نئے کشمیر کے گلزار کی فصلِ بہار
یک بیک کیوں ہو گئی یہ طبعِ نازک بیقرار
جنّتِ کشمیر کے پھولوں سے یوں مُنہ موڑ کر
چل دئے سُوئے عدم کیوں ہمکو روتا چھوڑ کر

گلشنِ کشمیر کے گلہائے تر مُرجھا گئے
سُن کے تیری موت کلیوں کو پسینے آ گئے
شور و شیون کی صدا سے قلب بھی تھرّا گئے
مطلعِ کشمیر پر پھر غم کے بادل چھا گئے

تیرے ماتم میں ہے ہر پیر و جواں ماتم کناں
آج بلبل کی زباں پر غم کے نوحے ہیں رواں

آہ اے مہجور، اے انسانیت کے شاہکار
پھول کے گُنتو نکلے کاری کے سحر آگیں خمار
سُن وہ کیا کہتے ہیں تیرے باغ کے سرو و چنار
مانگتا کوئی تو کرتے جان و دل تجھ پر نثار
ہم پہ ہے حاضر مگر آئی قضا تیرے لئے
ایک محشر سا ہے عالم میں بپا تیرے لئے

اکبر جے پوری

مہجور کی یاد میں

اے وطن کی آبرو! اے شاعرِ جنت نشین
تیرے نغموں سے خجل نغماتِ فردوسِ بریں
تیرے سازِ لب پہ نغمے حافظِ شیراز کے
تیری غزلوں میں نئے تیور نیاز و ناز کے
تیرے نغموں سے عیاں تھا سوز و سازِ زندگی
تو حقیقت کا پیامی، تو مجازِ زندگی
جذبۂ دل تو نقابِ شعر میں مستور تھا
قلبِ مضطر جلوۂ دیدار سے پُر نور تھا
زہرہ و ناہید کے نغمے سراسر تھے عیاں
اے کہ تیرے ہر نفس میں کیف نغماتِ جناں
تیرے نغموں کا ترنم اک سہارا ہو گئی
زندگی کی تلخ کامی بھی گوارا ہو گئی
شورشِ محفل کی رونق تیری تنہائی میں تھی
غم کی دھیمی آنچ تیری نغمہ پیرائی میں تھی
تیری آہِ نیم شب سے ماہ و انجم بے قرار
شاخساروں جوئباروں کا ترنم بے قرار
محفلِ شبنم میں گاہے اشک افشانی تری
گاہ زیرِ سایۂ گل زمزمہ خوانی تری

پروفیسر محمد یوسف

مہجور کی شاعری کے ابدی عناصر

کیا مہجور کی غزلوں میں ایسے عناصر بھی ہیں جو اُن کو ابدی بنا سکیں ہمیں ہوا ہی میں اس ابدیت کی تلاش نہیں کرنی چاہیئے۔ اس سلسلے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ابدی عناصر کی عدم موجودگی کے باوجود مہجور کے کلام میں یہ عناصر پیدا کرنے کی سعی کی جائے۔ اس کے علاوہ اس بات میں بھی احتیاط لازمی ہے کہ اپنے ہی تصورات لیکر مہجور کے کلام کی چھان بین نہ کیجائے اور اُن ذاتی تصورات کا جواب نہ ملنے پر شاعر کے کلام کو یک لخت رد کیا جائے اور جس کسی میں وہ تصورات ملیں، اُسی کو شہرۂ آفاق شاعر قرار دیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ مہجور کسی دوسرے شاعر یا کسی اپنے ہم عصر کے جیسا کیوں نہیں۔ اس تعلق میں اپنی ذاتی خواہشات کو الگ رکھکر اور اپنے تصورات کو اُس کے تصورات سے جُدا کر کے اس کی شخصیت اس کے تجربات اور تخلیقی محرکات کا مطالعہ کرنا ہے جب ہی حقیقت کا پتہ چل جائے تو چل جائے۔

مہجور ایک خاص ماحول میں رہتا تھا جس کا اسے شعور بھی تھا۔ اس ماحول سے اثر پذیر ہوکر اُس نے زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش بھی کی، جیسا کہ ایک اچھے فن کار کے لئے لازم ہے۔ مگر اُس کی شاعری کا تجزیہ کرتے وقت اس بات کو لمحہ بھر کے لئے بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ ایک غزل گو ہے۔ غزل ہی اُس کا خاص میدان ہے۔ مہجور نے اسی صنف کو اپنے اظہار کے لئے موزوں سمجھا۔ اس میں اس کے خارجی اور داخلی دونوں قسم کے تجربوں کا بیان ممکن ہوا۔ غزل ہی میں زندگی کی تلخ حقیقتیں بیان کیں۔ اسی میں سماجی خامیوں اور سیاسی کش مکش کی طرف اشارے کر کے عمل کی تلقین کی۔ اُس نے اس صنف کو اس قدر لچکدار بنایا کہ 'گریس کور'، 'لوکہ چار'، 'زون'، 'بہار'، وغیرہ جو اُس کی بیانیہ نظمیں ہیں۔ ان کو بھی غزل کے ہی رنگ میں رنگ لیا۔ ان تمام خوبیوں کے ہوتے ہوئے بھی شعرائے دیر

تعمیر

پائی کے لئے کسی اور ہی چیز کا محتاج ہے۔ شاعر کی فنی صلاحیتیں ہی شعر کی ابدیت کے لئے کام آسکتی ہیں۔ فن سے میرا مطلب ہیئت طرزِ بیان اور دوسری خارجی نزاکتیں ہی نہیں۔ بلکہ عظیم فن جب ہی پیدا ہوتا ہے جب موضوع اور بیان ہم آہنگ ہو جائے۔ دل کی گہرائیوں میں اُتر جانے والا نغمہ اُسی حالت میں پیدا ہوگا جب نغمہ اور ساز میں پوری طرح ہم آہنگی پیدا ہو جائے، جب شعر کی خونِ جگر سے آبیاری کی گئی ہو۔ اور لفظوں میں آکر اُس خون کی وہ حرارت اور رنگ و بو قایم رہے جو اُسے شاعر کے جگر کی تہوں میں حاصل تھی۔ اس کے لئے خلوص چاہیئے۔ شاعرانہ خلوص ہی حرارت، تڑپ اور شدت پیدا کر سکتا ہے۔ اسی لئے شاعر اپنے خونِ جگر کو زبان عطا کر سکتا ہے اور اِسے یہ مقام حاصل ہو تو پیغامبر کے منصب سے بالاتر ہو جائے۔

مہجور نے غزل ہی میں شاعری کی۔ غزل کا خمیر عشق کے داخلی جذبات اور قلبی واردات ہیں۔ مہجور کی غزلوں میں ہم اُس کے ذاتی جذبات اور اُس کی قلبی واردات کا ہی اظہار پاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی اور خیال کو تلاش کرنا مہجور سے ناانصافی ہوگی۔ اُس کی شاعری میں کوئی فکر انگیز خیال تلاش کرنا تضیعِ اوقات کے برابر ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مہجور کا اپنے ہم عصروں مثلاً آزاد سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ تقابلی تنقید فایدہ مند ضرور ہے لیکن اس صورت میں جب دو شاعر ہم مزاج ہوں۔ مہجور اور آزاد کے مزاج بالکل مختلف تھے۔ اس لئے ایک کے خیالات دوسرے میں تلاش کرنا اُن کی روحِ شاعری کے ساتھ ظلم ہے۔ حقیقت پسندی سے انحراف ہے۔ لیکن اس بات سے شاید ہی کوئی انکار کر سکتا ہے کہ کسی شاعر کا تجزیہ کرنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اُس کے دوست کون تھے، اُس کی زندگی کے تقاضے کیا تھے، سماجی اقدار اور نفسیاتی عوامل کا پتہ لگانا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ یہ بہت باتیں شاعر کی تخلیق پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ لیکن یہ سب حالات ہی تو ہیں۔ اسباب

نہیں۔ اسباب اور محرکات کئی ہو سکتے ہیں اور وہ بھی مختلف۔ ایک تحریک بنیادی ہوتی ہے جس سے فنی تخلیق وجود میں آتی ہے۔ وہ شاعر کی اندرونی کرید ہے۔ مہجور کا اکساوا اور وہ روح جو اس کی شاعری میں رواں دواں ہے ''تلاشِ حُسن'' ہے۔ یہی تلاش حسن مہجور کی نئی تخلیق کے لئے ذمہ دار ہے۔ ہم اُس کی شاعری میں کوئی فلسفہ یا کوئی فکر انگیز خیال نہیں پاتے لیکن اس میں زندگی ہے اور زندگی کی رعنائیاں ہیں مہجور کی شاعری فطری خواہشات محبت اور تلاشِ حُسن کی شاعری ہے۔

پیام مہجور میں چند انقلابی گیت ملتے ہیں وہ بھی غزل ہی کے قالب میں ڈھالے گئے ہیں۔ حسن کی اُمنگ ہر وقت اُس کے لاشعور میں رہتی تھی۔ ہاں جہاں کہیں اس کا دامن چھُوٹ گیا ہے، کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی ہے۔

رٹھکھ یم تیرِ مژگان قتلہ نِشہ پتھ
پتھہ یم ہاوان غریبن پہلوانی

(اپنے مژگاں کے تیروں کو قتل عام سے روکو۔ یہ غریبوں کو پہلوانی کا گر سکھا تے ہیں)

مقابلہ اکھ اکس ٹھہرن تہ کوت تام
یہ طاقت چون تےٗ میانِ ناتوانی

(یہ دو چیزیں ایک دوسرے کے مقابلے میں کتنی مدت رہ سکتی ہیں۔ تمہاری طاقت اور میری ناتوانی)

چند غیر شاعرانہ الفاظ محض بحر کو قائم رکھنے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں جو کانوں کو کرخت لگتے ہیں۔ جذبات مردہ اور تغزل معدوم ہے۔ اشعار ثقیل ہیں اور ایک بھاری بھرکم چھکڑے کی طرح حرکت کرتے ہیں۔ مجموعی اثر بالکل پھیکا ہے

مہجور کا شاہکار غزل ہی ہے۔ اس میں اُس کی شاعری کا نکھار اور اُبھار پایا جاتا ہے۔ اُس کے نغمے انسان کے حسین جذبات اُبھارتے رہیں گے۔ یہ نغمے انسان کے پاکیزہ اور بلند ترین جذبۂ محبت کا نتیجہ ہیں۔ مہجور محبت کا متوالا ہے اس کو محبت پر پورا بھروسہ ہے۔ انسان جو آجکل خطرات میں گھرا ہوا ہے اور اندھیرے میں ایک بچے کی طرح چیختا چلاتا ہے، محبت ہی کے سہارے اپنی دشواریوں کو دُور کر سکتا ہے۔ محبت ہی اس اضطراب اور عدم اطمینان میں دل آسائی کرتی ہے یہی جذبہ مہجور کے دل کی گہرائیوں میں اتر آیا ہے۔ اس کی نس نس میں سرایت کر گیا ہے۔ اسی کا پُرخلوص اظہار اس کی شاعری کو ابدیت بخشتا ہے۔ اور یہی اس کی حقیقت پسندی کی دلیل ہے۔

ذرہ ذرہ تھوٗنم زرہ کو تاہ ذرہ مہ سنت گو
کوِہ زانہ لوٗلک نقش دِلس کرمہ سنِت گو

(اُس نے مجھے درد بخشا۔ میں کتنا درد مند ہوں مجھے اس نے مار ڈالا۔ کون جانے محبت کا نقش میرے دِل پر کندہ ہوگیا۔)

پوشہ ڈُرمشکہ برتھک۔ رسہ پُاٹھ گنڈ مثر نکھ
اسہ ون دہانہ کرتھک آوارہ وارہ وارے

(تم نے غنچوں کو خوشبو سے بھر دیا۔ تو نے متبسّم ہونٹوں کو آہستہ آہستہ پریشان کر دیا۔)

مہجور چھُی دُوا بس دِلہ کس غمس عذابس
الفہ لولہ کس ربابس گنڈ تارہ وارہ وارے

(مہجور تیرے دل کے درد کا دوا صرف یہی ہے تو محبت کے ستاروں کی تاریں اُستوار کر)

اُلفتک سودا کُنم غم مولِ ہیوٗتُم
الفہ طریقس پیٹھ چلیوٗ بایار میون

(میں نے محبت کا سودا کیا اور غم مول لیا۔ اس طریقے پر میری تجارت چلتی رہی)

کوئی بھی ذی شعور مخلوق محبت کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ وقتی یا ہنگامی جذبہ یا خواہش نہیں۔ محبت انسان اپنے ساتھ لایا ہے۔ محبت اور حسن کی پرستاری انسان کو لہو و لعب سے پاک کر کے سنبلستان کی طرح شگفتہ کر دیتی ہے۔ زندگی کو نکھار بخشتی ہے۔ محبت ہی غنچوں کو خوشبو سے بھر دیتی ہے اور وہ مسکراتے ہیں۔ اس آڑے وقت میں جب انسان سوچ سوچ کر تھک گیا ہے محبت ہی اس کے کام آئے تو آئے۔ مہجور کی شاعری محبت کی تشنہ انسانی روح کی تلاش حسن ہے۔ مہجور کی روح اُس کی آنکھیں ہر وقت حسن کی ٹوہ میں لگی رہتی ہیں۔ مہجور اپنے محبوب کے رخساروں میں پرتوِ آفتاب کا متلاشی ہے وہ زلفِ جاناں کو سنوارنے کی دھن میں لگا ہوا ہے۔ وہ اس کوشش میں ہے کہ محبوب کا حسن زیادہ سے زیادہ نکھار پائے۔ وہ اپنے محبوب کو رنج و الم سے دُور رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی دل جوئی کے لئے اس کائنات کو ہر قسم کی گندگی اور غلاظت سے پاک دیکھنا چاہتا ہے۔ اور اس کی دل بہلائی کے لئے اُسے حسین تر بنانا چاہتا ہے۔ اس کا دل کسی قسم کا ظلم یا زبردستی دیکھکر خون ہو جاتا ہے۔ وہ آفاق میں تمام تر اقتصادی اور سیاسی جھگڑوں کا فوری حل چاہتا ہے۔ وہ اپنے سماج کی طبقاتی تفریق مٹا دینے کا آرزومند ہے۔ اور اگر

سماج اس کی محبت کی راہ میں کوئی رکاوٹ ڈالے تو اس کو بدل دینا چاہتا ہے

نیل لبکھ نز دیک پوشن حبائے گلزارس اندر
نہ گنڈ یلہ پوشہ نقرہ تل روٹ کنڈ یودامانہ چون

(محبت میں قربانیاں بھی درکار ہیں۔ وادیٔ عشق بڑی دشوار گزار ہے جد وجہد کے بغیر غنچے بھی نہیں کھلتے، جب تیرا دامن کانٹوں سے اُلجھ جائے جبھی تجھے پھلواڑی میں پھولوں کا قرب حاصل ہوسکتا ہے۔)

مذکورہ بالا اشعار میں موضوع بلند ہے جس کو ایک حسین پیرایہ میں ادا کیا گیا۔ جذبات کی شدت نے ہر شعر کو تغزل سے مالا مال کردیا ہے۔

لیکن یہ محض انفعالی تاثر ہی تو نہیں۔ شاعر نے محبت کے سہارے جو حسین دنیا تخلیق کی ہے کہیں وہ ہماری اس دنیا سے الگ تھلگ ایک خیالی دنیا تو نہیں۔ ان سوالات کے جوابات کے لئے مندرجہ ذیل شعروں پر نظر رکھنا ضروری ہے۔

ونتہ ہے دلبں بے وفائی شیوہ دلدار چھا
نازنین مہ جبین قتل وغارت کار چھا

(سکھی مجھے بتا بے وفائی کیا معشوقوں کا شیوہ ہے اور کیا ماہ جبین صرف قتل وغارت کا کام کرتے ہیں۔)

لالہ بیہ سالہ چھس پیالہ برہ نادان - پوشن مالہ کرہ نادان چھس
شالہ مار گوشن چھس ونھراوان - پوشن مالہ کرہ نادان چھس

(محبوب میرے ہاں آئیگا۔ میں جام سجارہی ہوں اور پھولوں کی مالائیں بنا رہی ہوں۔ شالہ مار کا نکھار اُتار رہی ہوں۔ اور گلدستے بنارہی ہوں۔)

داوسوننک پوشہ ونفرن باغہ کین چھکران ژوپور
کامہ دیو ییہ شامہ پت سُلہ باگراد کھ اشتہار

(بہار کی نسیم پھولوں کے پتوں کو چاروں طرف بکھیر دیتی ہے محبوب شام کو آئیگا مگر اشتہار سویرے تقسیم کئے گئے)

کشمیری شاعری میں محبت اور حُسن کا یہ تصوّر بالکل نیا ہے۔ "ونتہ ہے دلبں بے وفائی شیوہ دلدار چھا" کلام مہجور میں پہلی غزل کا پہلا شعر ہے۔ مہجور قدما کا تصوّرِ عشق دیکھکر کچھ ہراساں ششدر رہ جاتا ہے۔ جب وہ سنتا ہے کہ محبوب بے اعتنا اور جفا کار ہوتے ہیں۔ اس کو کچھ حیرانی سی ہوتی ہے۔ اُس کا ادراک حقیقت یقین ہی نہیں کرسکتا کہ حسن عشق سے احتراز کرے عشق نے یہ راز شاعر پر منکشف کیا ہے کہ حسینوں کا شیوہ وفا ہے بے وفائی نہیں حسن زندگی کو نکھارتا ہے۔ حسین قتل وغارت کے لئے نہیں آئے ہیں۔ محبت کی کرشمہ سازی مس خام کو کندن بنا سکتی ہے۔ لیکن حسن کو دیکھنے والی آنکھ مکمل طور حقیقت شناس بھی تو ہو۔ محبت کا یہ تصور حقیقت سے دُور نہیں۔ محبت میں خوشی اور غم دونوں ہیں۔ دو میں سے کسی ایک کو نظر انداز کرنا حقیقت سے تجاوز اور خود فریبی ہے۔ لیکن مہجور کا غم روائیتی غم نہیں کہ انسان کو افسردہ کرکے زندگی ہی سے بیزار کردے۔ محبت دنیا کو خلد بریں بنا سکتی ہے۔ حوریں شاعر کے بناؤ سنگار پر رشک کرتی ہیں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عاشق کو غم کا تلخابہ بھی پلایا جاتا ہے۔ اور وہ نیم بسمل سا ہوجاتا ہے۔ محبت اور حسن اُس کو پھر بحال کردیتے ہیں۔ غم پر خوشی کی فتح ہوتی ہے۔ مہجور کا محبوب اُس کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر نہیں گیا ہے۔ اُسے پورا یقین ہے کہ وہ واپس آئیگا۔ وہ محبوب کے خیر مقدم کی خوب تیاریاں کرتا ہے۔ اُس نے باغ کو سجا رکھا ہے۔ وہ محبوب کو ہار پہنانے کے لئے پھول چُن رہا ہے۔ محبوب کی آمد کی خبر کوئی نئی نہیں۔ یہ بہت پہلے مشتہر ہوا ہے کہ وہ آئیگا اور پھولوں کی نازک نازک پنکھڑیاں شاخوں سے گرتے ہوئے محبوب کی آمد کا اشتہار دے رہی ہیں۔ محبت کی یہ کامرانیاں یہ وقتی غم جو پائندہ خوشی کے لئے ہے، یہ انتظار جو ملاپ کے لئے ہے اور یہ بے پناہ اُمید و یس جو محبوب سے وابستہ ہیں، انسان کو افسردگی سے بچا لیتی ہیں اور عمل کی تلقین کرتی ہیں۔

یم زہ یود باہم رلن ادہ کوہ الن سنگر ڈلن
دردہ مت یم میون آلو ساز تے سامانہ چون

(اگر ان دو چیزوں کا اجتماع ہوجائے تو پہاڑ ہل جائیں، یعنی میرے درد بھرے بلاوے اور تمہارا ساز و سامان۔)

مہجور موتس کیاہ چھو کھوژن موت چھہ معراج
لوہ آفتابس لارہ نھو د تس کھارہ محبت

(مہجور موت سے ڈرنا کیا۔ یہ تو آدم خاکی کی معراج ہے۔ شبنم جب سورج سے مٹ جاتی ہے تو بلندیوں کو چھو لیتی ہے۔)

نہ گنڈ گوس بیدار کنن کنجہ بولن گوم
زونم مہ وندہ سور یوٗ پرتو تر دو سونت کالن

(بر ظلمت میں بیدار ہوا، اور پرندوں کی صدائیں سُنیں میں نے جان لیا کہ جاڑا

گیا اور بہار آگئی۔)

سخت گیر نقاد اس بات سے انکار نہ کرسکے گا کہ مہجورؔ نے شاعری اور موسیقی کی قرابتِ طرفین کو استوار کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی عیاں ہے کہ اُس نے وہ رشتہ بھی جو شاعری اور موسیقی میں مستحکم کیا ہے یہ رشتہ مہجورؔ کی شاعری میں جس قدر قریب تر ملتا ہے۔ وُہ دنیا کے چند ہی عظیم شعراء کے حصے میں نظر آتا ہے۔ مہجورؔ ایک مصوّرِ شاعر ہے۔ جو کام مصوّر رنگ اور موقلم سے لیتا ہے وُہ کام مہجورؔ الفاظ کے ذریعے سرانجام دیتا ہے۔ کلام مہجورؔ ایک تصویر خانہ ہے جس میں رنگ رنگ کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ مہجورؔ بے جان کو جان اور غیر مرئی کو جسم دیکر اپنے شعروں میں دکھلاتا ہے۔ اُس نے ان تصویروں کو گوشت پوست عطا کرکے ان میں گہرے رنگ بھر دئے ہیں۔

شُلہ گرایہ ماران ژھایہ یاٚژھ دوت واو پوشن نِش
وُلسس یہ چھے ڈُگہ رائے جانی ہاسے۔ مدنو

(صبح ہی صبح اٹھکیلیاں کرتی ہوئی نسیم پھولوں کے قریب آئی۔ شاید یہ محبت کو تمہارا بلاوا ہے میرے ساجن!)

واوُ ضبحک شُلہ اوسس لاران تنبہ لیومُت کس تھام ژھاران
خندہ پوشو کرِسس جائے جائے پایہ بڑھ مانہ یاون رائے

(نسیم سویرے ہی تڑپتی ہوئی اور کسی کی تلاش میں جارہی تھی۔ پھولوں نے اُس پر ہنسا۔ میرے پیار!)

صبا کی چند تصویریں کھنچی گئی ہیں۔ ہوا چلنے لگتی ہے اور پھول کھل اُٹھتے ہیں۔ ہوا ایک عاشق ہے جو نظریں بچا بچا کر اپنے محبوب پھول سے ہم دامن ہوتی ہے۔ محبت بیدار ہوتی ہے۔ ہوا جو ویسے تو دکھائی نہیں دیتی لیکن جب پھول کھِلتے ہیں گویا ہم اِسے دیکھ ہی لیتے ہیں۔ دوسری تصویر میں ہم نسیم صبح کو ایک مضطرب عاشق کی طرح دوست کی تلاش میں سرگرداں دیکھتے ہیں۔ پھول جگہ جگہ اس سراسیمہ عاشق کی ہنسی اُڑا رہے ہیں۔

مہجورؔ کے کلام میں عکاسی اور مصوّری کے عناصر کا تجزیہ کرتے وقت اُس کی بیانیہ نظموں میں سے بہارؔ، زوونؔ اور وزملؔ کا ذکر لازمی ہے یہی تین نظمیں مہجورؔ کو شعراء کی صفِ اولین میں جگہ دینے کے لئے کافی ہیں

بہارؔ، زوونؔ اور وُزمل میں مظاہر فطرت کو انسانی صفات دینے کا کس قدر شوق ہے۔ بہارؔ، چاندؔ اور بجلی کو انسان کے اوصاف انسان کے حُسن اور اُس کے جذبات دئے گئے ہیں۔ یکے بعد دیگرے تصویریں آنکھوں کے سامنے آتی ہیں۔ انسان کی طرح بہار پھر حسب معمول جگانے آئی ہے وُہ سوتوں کو جگاتی ہے اور دردمندوں کو سنوارتی ہے۔ چاند پوری طرح ہماری زمین کی ایک انسان ذات بن گئی ہے اور نام ہی کی افلاکی شے ہے۔ پتہ نہیں اس دوشیزہ (چاند) کا سسرال اور میکا کہاں ہیں۔ اور اس کا رفیق حیات کون ہے۔ ایک داغدار عاشق کی طرح دوست کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ بجلی ہماری ہی زمین کی ہے لیکن کچھ تنگ سی آکر وطن کو چھوڑ چلی ہے۔ لیکن حُبّ وطن سے مجبور مُڑ مُڑ کر دیکھ رہی ہے۔ یا وُہ بات نہیں۔ شاید کوئی ٹوٹا دیا لیکر محبوب کی تلاش میں نکلی ہے۔ یا کبھی ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی معصوم بچہ آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔

مظاہر فطرت کی عکاسی کرتے ہوئے مہجورؔ ان مظاہر کو انسان سے الگ کرکے نہیں دیکھتا ہے۔ وُہ انسان اور فطرت میں ایک عجیب سا رشتہ پاتا ہے۔ اگر کبھی انسان کو فطرت کے ساتھ متصادم بھی پاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی فطرت کو انسان کا رازدار اور مددگار بھی محسوس کرتا ہے۔ وُہ اپنے آپ کو بہار، چاند اور بجلی کے سُپرد کردیتا ہے اور اُن کو اپنے دُکھ درد بتاتا ہے۔

لیکن لوک شاعری کا یہ رُتبہ اور دوسری طرف رومان اور کلاسکل کا تال میل اور نئی نزاکتیں کہاں تک مہجورؔ کی عظمت کی حامل ہوسکتی ہیں۔ یہ ہنگامی قبول عام کہاں تک ابدیت اور آفاقیت اختیار کرسکتا ہے۔ اسکا جواب ابھی کچھ عرصہ کے زیادہ یقین کے ساتھ دیا جاسکے گا۔ کیونکہ مہجور ہمارے لئے ابھی بالکل ایک آندھی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم خود اُن نظریات تعصبات اور انداز فکر کے اسیر ہیں۔ جن میں مہجورؔ نے اپنی زندگی گذاری اور اس طور ہمارے فیصلے مستند قرار نہیں دئے جاسکتے۔ کیونکہ ہم ان رجحانات پر کوئی رائے صادر کرتے وقت اپنے ذاتی تعصبات میں اُلجھ کر بھٹک سکتے ہیں۔ آنے والا نقاد ان تعصبات سے بالاتر ہوکر جب کوئی رائے صادر کریگا۔ تو ظاہر ہے کہ وُہ اس کے آفاقی پہلوؤں کو بھی اُجاگر پائے گا۔

فرصت کشمکش مدہ ایں دل بیقرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

گھنشیام سیٹھی

مہجور سے ایک ملاقات

اکتوبر، نومبر ۱۹۵۱ء کے وہ دن —— خلوص اور سادگی کے پیکر مہجور تب بیمار تھے — بہت بیمار —— اور علاج کے لئے مہری نگر لائے گئے تھے۔ لیکن سانس کے دباؤ کی سختی کے علاوہ اُن کے چہرے پر بیماری کی نہ کوئی علامت تھی اور نہ ہی کوئی اثر تھا۔ جھریوں سے بھرے چہرے کے ایک ایک خط میں ایک جلال اور لاأبالی پن سا جھلکتا تھا — جیسے پہاڑ کی اُترائی میں ڈھلتے دن کی دھوپ چمکتی ہے، کچھ ویسی ہی چمک ان کے چہرے پر تھی۔ ان کے کردار میں ایک عجیب سا خود اعتمادی کا عنصر تھا جو ملنے والے سے اچانک ایک ناطہ جوڑ لیتا تھا۔

ستیہ وتی جی اور واتسایَن سے لے کر شیو دان سنگھ چوہان تک کے الگ الگ نظریوں اور اعتقادات رکھنے والے لوگوں سے مہجور کے تذکرے سُنتے تھے۔ بلراج ساہنی اور دیوندر ستیارتھی کے مضمون بھی ان پر پڑھے تھے۔ لیکن انکی شخصیت کے ساتھ نہ تو ستیارتھی کے تذکرے ہی انصاف کر پاتے تھے اور نہ بلراج ساہنی کا وہ اسکیچ جو اُنہوں نے شانتی نکیتن کے 'وشو ابھارتی' میں لکھا تھا۔ وہ ان بیانات سے بہت بلند تھے لمبا قد، گورا رنگ، چھوٹی چھوٹی لیکن پُر نور آنکھیں جن میں کالی کالی پتلیاں بڑی بے چینی سے اِدھر اُدھر بھٹکتی تھیں۔ کٹی چھٹی مونچھیں اور پکے بال، ہنسوڑ چہرہ — اس سیدھے سادے آدمی کی صلاحیتوں کا اندازہ انکی شکل وصورت سے نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ وہ اپنی شاعری کے محل کے بوجھ اپنے سر پہ لاد کر کبھی آپے سے باہر نہیں ہوئے۔ اُسکے چہرے کی تبسم آمیز چمک اور آنکھوں کی کوروں سے پھوٹتی ہوئی جھریاں پکار پکار کر کہتیں کہ وہ وقت اور زمانے کی حرکت کی اُپج نہیں — بلکہ ایک عمیق اور گہرے انسانی مطالعے سے پائے ہوئے تجربے اور احساس کی عمر تھیں — ایسے تجربے احساس اور علم کی — جو محبت کے جذبے سے بھرپور تھا۔

بہار پھر سے آئیگی۔
مہجور تو محبت کا سنگیت نیا ر رکھ۔
پھول تو خود ہی کھلیں گے، تو صرف ایک بہانہ بن۔

میں اور واتسائن جب اُن سے ملنے گئے تو چند لمحوں میں ہی وہ ہم سے گھل مل گئے۔ مزاج میں تکلّف نام کو نہیں اور خود اس قدر مخلص اور اخلاق نواز کہ کشمیری طبیعت سے ناواقف واتسائن اُن کی ہر بات پر کچھ کچھ حیران رہ جاتا۔ انہوں نے بتلایا کہ ایسے لوگوں سے ملکر اُنہیں خوشی ہوتی ہے جو ظاہرداری اور ریاکاری کے چکر سے بری ہوں۔ غالباً یہی وجہ ہے سماجی ڈھانچے میں غیر معمولی طور پر اہم ہونے کے باوجود کئی ایسے لوگوں سے وہ کتراتے تھے — اور ان کے متعلق اپنے خیالات وجذبات کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے تھے یہ حقیقت ہے کہ اُنہوں نے کبھی اپنی خودداری اور اصول پرستی کے دعوے نہیں کیئے۔ لیکن عمر بھر وہ ان چیزوں پر قایم رہے اور سادگی کو اپنا لیا

ایک بار شیو دان سنگھ کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اُنہوں نے کہا تھا " محمود گامی کے بعد کشمیری شاعری میں فارسی الفاظ کے سیلاب کو روکنے کے لئے قدرت نے مجھ کو پیدا کیا۔" اُن کی آواز میں غرور نہیں اعتماد تھا، بلکہ منہ پر حلیمی اور انکساری اور بھی عیاں ہو گئی تھی۔ اُنکے جواب میں خود پرستی نہ تھی بلکہ صاف گوئی، نہ اُنکے لہجے میں طنز کی تلخی تھی، حالانکہ کشمیر کے En- Lightened طبقے نے ایک لمبے عرصے تک ان کی ناقدری کی۔ ہمارے سماج کا یہ المیہ ہے کہ جب تک باہر والے آکر ہمارے فن کو نہ پرکھیں، فتوے نہ دیں، فنکار اور اُس کا فن دونوں گمنامی کی دھول میں اَٹے رہتے ہیں۔

شاید ۱۹۳۴ء میں دیوندر ستیارتھی نے سب سے پہلے مہجور کے بارے

میں 'ماڈرن ریویو' میں لکھا تھا۔ اُس کے بعد بلراج ساہنی نے شانتی نکیتن کی نوکری کے دوران میں ان پر ایک سکیچ لکھا تھا۔ جس کی بدولت رابندر ناتھ ٹیگور تک مہجورؔ کا کلام اور نام پہنچا۔ شانتی نکیتن کے مجلہ "وشوا بھارتی" میں یوں رقمطراز ہیں:۔

"اگر مہجور آج ایک گیت لکھتے ہیں تو وہ پندرہ، بیس دن میں ہی عوام کی زبان پر ہوتا ہے۔ اسکول جاتے ہوئے بچے، دھان کوٹتی اور پھٹکتی ہوئی کشمیر کی دوشیزائیں، ڈونگے کھیتے ہوئے مانجھی، ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے مزدور ——— سب کے سب اس گیت کے دیوانے ہو جاتے ہیں۔ ایک ناخواندہ ملک میں، جہاں ایسی چیزوں کو شائع کیا جائے تو شاید دس کاپیاں بھی ضرورت نہ ہوں۔ ان کی مقبولیت کا یہ عالم کسی معجزے سے کم نہیں۔"

لیکن اس سب کے باوجود بھی سرینگر کے En-lightened طبقے نے مہجورؔ کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ ایک طرح سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جسے کشمیر کی سرحدوں پر رہنے والا ہر چرواہا اور وادی کا ہر دہقان جانتا تھا۔ انگریزی، فارسی، سنسکرت اور اردو دان طبقہ اس سے ناواقف تھا۔ یا جان بوجھ کر ناواقف بنا رہنا چاہتا تھا۔

شاید اسی زمانے میں پنڈت آنند کول بامزئی نے ان کی دو نظموں کا ترجمہ "وشو بھارتی" میں شائع کرایا ——— "پوشی مت جانانو" اور "گریس کور" ——— ان نظموں کو پڑھ کر رابندر ناتھ ٹیگور بہت مرعوب ہوئے، اور انہوں نے خود مہجورؔ کو لکھا۔ "میرے اور آپ کے وچار آپس میں بہت ملتے ہیں۔ اگر آپ انگریزی یا بنگلہ زبان سے واقف ہوتے تو میں یہ شک کرتا کہ آپ نے میرے خیالات کو اپنی زبان میں ڈھالا ہے ——— مجھے آپ کی تخلیقات پر ناز ہے۔ آپ بجا طور پر کشمیر کے ورڈزورتھ ہیں۔"

شاید انہیں خطوط اور مضامین کی بھنک جب مندرجہ بالا فارسی، سنسکرت اور انگریزی دان طبقے کے کرمفرماؤں کے کانوں میں پڑی۔ تب انہیں ہوش آیا اور اسی بیرونی توجہ کا اثر تھا کہ مہجورؔ کو پہلی بار کسی مشاعرے میں مدعو کیا گیا ——— اور سادگی کا یہ مجسمہ نیستانِ شعر میں چمک اُٹھا۔ احترام سے عالموں اور نقادوں کے سر جھک گئے۔ جس وقت مہجورؔ اپنی یہ سحر آرائیاں بیان کر رہے تھے۔ اُس وقت اس پیرانہ سالی اور بیماری کے عالم میں بھی ان کے چہرے پر ایک تازگی اور شگفتگی سی عود آئی تھی۔ ان کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ ان میں ایک عجیب جوش پیدا ہو گیا تھا، وہ مُسکرائے بھی، اور اس مسکراہٹ میں یہ اعتماد بھی تھا کہ فتح ان کے فن کی تھی۔ اور اس کے بعد وہ ہمیشہ فاتح رہا۔

لیکن شہر کی گہما گہمی اور شور شغب سے انہیں نفرت تھی۔ شاید یہ ان کی اس نوکری کے ماحول کا ردِ عمل تھا، جس کے سلسلے میں وہ ہمیشہ دیہاتوں ہی میں رہے۔ انہوں نے بتلایا کہ آبادیوں میں رہنے سے اُنہیں اتنی مسرت نہیں ہوتی جتنی دُور دُور تک پھیلے ہوئے پہاڑوں کے دامنوں میں، گنگناتی ہوئی ندیوں، آبشاروں اور جھرنوں کی خاموش موسیقیوں میں بیٹھ کر ہوتی ہے۔ شہروں کی زندگی اُنہیں راس نہیں آتی تھی۔

انہیں دنوں جیسا کہ مہجورؔ کے بارے میں لکھتے ہوئے میں نے "نئی چیتنا" میں کہا تھا کہ "مہجور کشمیر کے "جن کوی" (عوامی شاعر) ہیں لیکن جنوادی (اشتراکی) کوی نہیں ہیں' یہ فرق ان کی شاعری میں نمایاں طور پر واضح ہے۔ حالانکہ مہجورؔ کی شاعری سے متعارف کئی ہندی نقاد میری اس بات کو سُن کر ہنسے تھے میں آج بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں، بلکہ میرے خیال میں ان کی ساری شخصیت کا نچوڑ اسی ایک بات میں ہے، وہ عام قسم کے ایک انسان تھے۔ شعراء کی بناوٹ اور تکلفات اُنہیں چھو تک نہیں گئے تھے، انہوں نے فن کی بلندیوں پر پرواز کی ہے، اور وہ ان ادیبوں سے بالکل مختلف تھے، جن کا قلم، فن کی بلندیوں تک تو پہنچتا ہے، لیکن زندگی اور زندہ رہنے کے فن سے بے بہرہ ہوتا ہے۔ وہ ایک حقیقت پسند دنیا میں رہتے ہوئے عینیت کی تلاش میں سرگرداں رہے، اور اُسے پا گئے، یہی اُن کا کمال تھا۔ اُن کا دردمند دل انسانیت کا جوہر تھا میں نے کسی شاعر کے چہرے کی جھریوں کے ہر خط میں سے ٹپکتی ہوئی وہ شفقت، وہ معصومیت، وہ اُمید اور وہ جلال نہیں دیکھا، جو مہجورؔ کے کردار اور فلسفہ حیات کے عوامی پہلو تھے۔ یہی وہ صفات ہیں جن میں ان کی "شاعر شخصیت" کی تاریخ دفن ہے۔

غلام محی الدین مجبورؔ

مہجورؔ کا آخری سفر

۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء کی صبح تھی۔ ایسی ہی صبح جیسی روز ہوا کرتی ہے، مگر پھر بھی یہ صبح کتنی مختلف تھی۔ یہ صبح اپنے دوش پر کشمیر کے حسن آزادی اور سربلندی کے نغمہ خواں مہجورؔ کی موت کی خبر لائی تھی۔ میں صبح ہی کالج کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے میں جب ایک سماعتی مرکز پر مہجورؔ کی موت کی خبر کانوں میں پڑی، تو میرا دل جیسے ایک لمحے کے لئے دھڑکنا بھول گیا۔ وہ جس نے کشمیریوں کے مفلوج نطق کو پھر گل بار کر دیا تھا جس نے کشمیر کی ویران وادیوں کو اپنی آتش نوائی سے پھر دہکا دیا تھا۔ جس نے غنیؔ - للہ دید - حبہ خاتون اور رسول میرؔ کی شراب کہنہ کو پھر سے نئے جام و مینا میں چھلکا کر کشمیریوں کو ایک ایسی صہبا سے پُرخمار کر دیا تھا کہ اُن کو صدیوں کے ظلم و ستم بھول گئے تھے۔ وہ ایک آنے والی بہار کے انتظار میں دور رفتہ کی تمام کلفتوں کو فراموش کر گئے تھے، اور جب بہار آگئی - تو اس کا مدح خواں - کشمیر کے بوستاں کا چہکتا ہزار داستاں خاموش ہوگیا تھا۔ شاید وہ اُس عالم کی تلاش میں گیا تھا "جہاں کی بہار پا بہ رکاب نہیں ہوتی۔"

کالج میں یہ خبر پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ گھنٹہ بجتے ہی تمام کالج احاطے میں اُمڈ آیا۔ وہاں پر چند پروفیسروں اور طلباء نے اُس دولت کا سرسری طور ذکر کیا، جس سے آج کشمیری محروم ہوگئے تھے۔ اُن کے بشرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اُن خیالات کی پوری ترجمانی نہیں کر سکتے، جو اُن کے دل کے نہاں خانوں میں پرورش پا رہے ہیں۔ شاید ایسے ہی مواقع کیلئے اقبالؔ کا یہ شعر کہا گیا تھا ؏

گفتار کے اسلوب پر قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

اس مختصر سی تقریب کے بعد کالج میں چھٹی کر دی گئی میں اِبراکدل پہنچ گیا۔ وہاں کچھ جیپیں مہجورؔ کے گاؤں متری گام جانے والی تھیں، ایک جیپ جس پر عارفؔ صاحب اور نادمؔ صاحب بیٹھے ہوئے تھے، مجھے بھی جگہ ملی، اور یہ قافلہ کوئی بارہ بجے پلوامہ پہنچ گیا۔ جہاں سے شاعر کا گاؤں چند میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ جہاں صرف پیدل ہی جانا پڑتا تھا۔ چنانچہ یہ سارا قافلہ جس میں مہجورؔ کے نغموں کے شیدائی تھے، بھوک اور تکان سے بے نیاز چل پڑا۔ مجھے یاد ہے کہ سرسوں کے کھیت اپنی پوری بہار پر تھے، اور ہمیں راستے میں ایک چرواہا مہجورؔ کا ایک درد آمیز بند گنگناتے ہوئے ملا تھا، جسے سُن کر ہماری جماعت کے اکثر آدمی آنسو ضبط نہ کر سکے تھے۔

دو بجے کے قریب جب ہم متری گام پہنچے ہی تھے، جناب بخشی غلام محمد (جو اُس وقت نائب وزیراعظم تھے) اپنے چند اور رفیقوں کے ساتھ متری گام پہنچ گئے۔ پوچھ گچھ پر معلوم ہوا کہ مہجورؔ ۸ اپریل کی صبح کو اپنی پنشن لینے کیلئے پلوامہ گئے تھے، اور وہاں سے رات گئے جب لوٹنے لگے تو طبیعت خراب ہوگئی اور اُن سے گھوڑے پر چڑھا نہ جا سکا۔ چنانچہ چند دوستوں نے آپ کو سہارا دیکر متری گام پہنچایا۔ آپ کو جب گھر میں اُتارا گیا، تو آپ کی زبان لکنت آمیز ہوگئی تھی، اسی عالم میں کچھ باتیں کر کے آپ نے حقہ طلب کی اور صبح صادق کے وقت جان، جان آفرین کے سُپرد کر دی - ۹ اپریل کو یہ خبر بہت دیر کے بعد سرینگر پہنچی - چنانچہ مہجورؔ کے اقارب نے یہ سمجھ کر کہ وہاں سے کوئی نہیں آیا ہے، آپ کو مقامی قبرستان میں دفن کر دیا - یہ خبر ہماری جماعت کے تمام افراد کے لئے سوہانِ روح ثابت ہوئی۔ کیونکہ ہم سب لوگ اُن کی نماز جنازہ میں شرکت کے لئے آئے تھے۔

جنابِ بخشی غلام محمدؐ کی آمد پر مہجورؔ کے چناروں کے چھاؤں تلے ایک چھوٹی سی محفل منعقد ہوئی۔ اس محفل کا وہ منظر مجھے اچھی طرح یاد ہے جب شاعر کے ایک ان پڑھ کسان دوست نے اُن کی نظم " ویسیئے آؤ نوکھ یار کوت گوم " نہایت جگر سوز لہجے میں سنائی تھی۔ اور جناب بخشی صاحب سے لیکر باقی ہر شریک محفل کی آنکھیں ساون بھادون بنی ہوئی تھیں۔

جناب بخشی صاحب نے وہیں پر تجویز کی کہ حضرت مہجورؔ کا جنازہ سرینگر پہنچایا جائے۔ جہاں اُن کے ہزاروں شیدائی اُنہیں شایانِ شان خراجِ عقیدت پیش کر سکیں، اور اُس کے بعد اُنہیں حبہ خاتون کے مزار واقع اتھہ واجن میں دفن کر دیا جائے۔ تاکہ آنے والی نسلیں اپنے اس محبوب شاعر کے مزار سے زندگی کا سُراغ پاتی رہیں اور اس خطۂ زمین کو " مزارِ شعراء " کے نام سے موسوم کر دیا جائے۔ دیہاتیوں نے پہلے تو اس تجویز کی مزاحمت کی کیونکہ وہ اپنے محبوب شاعر سے، جس نے اُن کے دُکھ درد کو اپنی نغمہ سرائیوں سے گھٹا دیا تھا، مفارقت نہیں چاہتے تھے مگر جناب بخشی صاحب نے انہیں سمجھایا کہ اُن کا فیض اتنا عام ہے کہ اسے محدود کر دینا ظلم ہے۔ تو وہ مان گئے اور فیصلہ ہوا کہ راتوں رات اِسے سرینگر پہنچا دیا جائے۔

۱۱ اپریل کی صبح کے دس بجے شاعر کا جنازہ خانقاہ معلیٰ کے احاطے میں رکھا گیا تھا۔ اور صبح سے ہی ہزاروں لوگ، مرد۔ عورتیں اور بچے جوق در جوق آکر اپنے محبوب مغنی کا آخری دیدار کر رہے تھے۔ مہجورؔ کا جنازہ ایک سجے سجائے تابوت میں رکھا گیا تھا۔ جس پر اُن کا یہ شعر لکھا گیا تھا ؏

مہجورؔ مہ ترس کیاہ چھُو کھوژُن، موت چھُوی معراج
مرُ مرُ چھی ہیران زندگی۔ وسواس مرنک تراؤ

(ترجمہ:۔ مہجورؔ موت سے خائف ہو نا کیا۔ موت تو آدمِ خاکی کے ارتقاء کی ایک منزل ہے۔ مر مر کے آخر زندگی کی ہی فتح ہوتی ہے۔ تو موت سے ڈرنا کیا۔)

دو بجے کے قریب ہزاروں لوگوں نے خانقاہ معلیٰ کے تاریخی احاطے میں اُن کی نمازِ جنازہ ادا کی۔ اور اُس کے بعد اُن کے جنازہ کو جلوس کی صورت میں امیراکدل پہنچایا گیا۔ جلوس کے آگے آگے ملیشیا اور پولیس کے دستے تھے اُس کے بعد قومی کلچرل کانگرس کے ارکان سیاہ ماتمی علامت لگائے جا رہے تھے اور اُس کے بعد عام لوگوں کا انبوہ کثیر گریاں گریاں جا رہا تھا۔ امیراکدل سے جنازہ ایک پھولوں سے آراستہ گاڑی میں رکھ دیا گیا۔ اور اُس کے عقب میں عام لوگ لاریوں سے اور پیدل جا رہے تھے۔ کوئی تین بجے کے قریب جنازہ اتھہ واجن پہنچا دیا گیا۔ اور یہاں سے جناب بخشی غلام محمد۔ دینا ناتھ نادمؔ۔ مرزا عارفؔ اور باقی ادب نواز شخصیتوں نے تابوت کو کندھا دیکر قبر تک پہنچایا! اور اُس کے بعد انیس توپوں کی سلامی کے پس منظر میں جناب بخشی غلام محمد نے شاعر کے جسدِ خاکی کو تربت میں اُتارا۔ اور اُس کے بعد عوام کے سیلِ بے پناہ کو تحریک سی مل گئی۔ اور ہر ایک ہاتھ آگے بڑھنے لگا۔ تاکہ شاعر کی تربت کو ڈھانپنے کی سعادت سے محروم نہ رہ جائے۔ اور چند منٹ کے بعد ؏

جس کی آوازوں سے لذت گیر اب تک گوش ہے
وہ جرس بس اب ہمیشہ کیلئے خاموش ہے

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد جناب بخشی صاحب مخاطب عوام سے مخاطب ہوئے:۔

" ہموطنو! آپ کا غم میرے لئے اجنبی نہیں ہے۔ کیونکہ میرا دل بھی اس درد کی آنچ سے تپ رہا ہے۔ مگر کیا یہ بھی حقیقت نہیں ہے کہ مہجورؔ مرا نہیں ہے، زندہ ہے، کیونکہ اُس نے جن نغموں کی تخلیق کی۔ اور جن گیتوں کا دیپک راگ گایا۔ وہ اُس وقت تک زندہ رہینگے جب تک انسانی دل میں حُسن زندگی اور ارتقاء سے محبت کا جذبہ زندہ ہے۔ آیئے ہم سب عہد کریں کہ مہجورؔ کے دیئے ہوئے پیغام کی مطابقت میں اپنے وطن عزیز کو پھر سے ترقی کی معراج تک پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔"

اس خطاب کے تھوڑی دیر بعد مہجورؔ کی تربت کے اوپر ایک بزمِ قوالی منعقد ہوئی اور مہجورؔ کے نغمے ساز کی لہروں پر تھرکنے لگے۔ محفل کبھی روتی تھی اور کبھی مُسکراتی تھی ـــ ہاں مہجورؔ ہمارے آلام اور مسرتوں ـــ دونوں کا بربط نواز تھا ـــ اور پھر جب آسمان پر چاندنی چھٹکی تو یہ بزمِ موسیقی ختم ہوگئی۔ اور کشمیر کے لوگ اپنے محبوب نغمات کے خالق کو تاریخ کی رفعتوں کے سُپرد کر آئے ؏

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اُس گھر کی نگہبانی کرے

نریش کمار شاد

نیا کشمیر

دیکھ وُہ تیرے سرد افق سے
لال۔ گلابی۔ کرنیں پھوٹیں
دیکھ وُہ تیرے جسم سے آخر
صدیوں کی زنجیریں ٹوٹیں
دیکھ وُہ تیرے بدخواہوں کی
سانسیں اُکھڑیں، نبضیں چھوٹیں
دیکھ وُہ تیرے بچھڑے بچے چوم رہے ہیں تیرے گام
اے کشمیر کی سندر دھرتی تجھ کو شاعر کا پرنام

قدم قدم پر نگر نگر میں
خوشیوں کے پرچم لہراتے
آشاؤں کے اندھیارے میں
خون سے لاکھوں دیپ جلاتے
جاگ اُٹھے ہیں تیرے بچے
جاگ اُٹھے ہیں نیند کے ماتے
جاگ اُٹھے ہیں سب نر ناری جاگ اُٹھے مزدور تمام
اے کشمیر کی سندر دھرتی تجھ کو شاعر کا پرنام

دیکھ وُہ اپنے راج دُلارے
بھوکے ننگے اور سوالی
آنکھوں میں مستی کی لہریں
چہروں پر خوشیوں کی لالی

ڈگ مگ ڈولے راج سنگھاسن
تھر تھر کانپے راج کا والی
ڈگر ڈگر پر جشن بپا ہے راج محل میں ہے کہرام
اے کشمیر کی سندر دھرتی تجھکو شاعر کا پرنام

سرمائے کا مرتا ڈھانچہ
کون سنبھالے، کون بچائے
کون یہ سُرخ انگارے پکڑے
کون یہ پھیلی آگ بجھائے
کون امنڈے طوفان کو روکے
کون چٹانوں سے ٹکرائے
اپنا بل پہچان چکے ہیں اب تیرے مظلوم عوام
اے کشمیر کی سندر دھرتی تجھ کو شاعر کا پرنام

پھوٹ کے تیرے ساز سے پھیلیں
آزادی کے گیت کی تانیں
پورب۔ پچھم۔ اتر۔ دکھن!
بول اُٹھیں خاموش زبانیں
کھول رہی ہیں لاوا بن کر
دُنیا بھر کی کچلی جانیں
ہر سینے میں تیری دھڑکن ہر لب پر تیرا پیغام
اے کشمیر کی سندر دھرتی تجھ کو شاعر کا پرنام

دیپک کول

جتوں توں

پھاگن کا مہینہ تھا شوراتری کے دن تھے اور تِلا اشٹمی کا تیوہار تھا۔ وِتستا کے دونوں کناروں پر اَن گنت دیئے جھلملا رہے تھے۔ اور اکے دُکے وِتستا کے پانیوں پر بھی تیل کے چراغ بہتے نظر آ رہے تھے۔ نوبیاہتا دُلہنیں اور شوخ سیانی لڑکیاں اپنی ساسوں اور ماؤں کے ساتھ خوش خوش شرماتی سی لجاتی سی ہاتھوں میں تھالیاں اور تھالیوں میں وٹک راج کی مورتیاں، پھول پھل لئے، ٹھمک ٹھمک کر اندھیری گلیوں اور تنگ بازاروں میں سے ہو کر وِتستا کی طرف جا رہی تھیں۔

نوبلوں کے درمیان وِتستا کے کناروں پر لگ بھگ سبھی گھاٹ جگمگا رہے تھے۔ ہر گھاٹ پر میلے کا سا شور، وہی رنگ اور وہی دمک تھی۔ عورتوں کا گھاٹ اُترنا اور گھاٹ چڑھنا فضا میں ایک انجانی سی سرسراہٹ پیدا کر رہا تھا، مندروں سے شنکھ اور گھنٹیوں کی صدائیں فضا میں انوکھا سا سنگیت بھر رہی تھیں۔ اور بچوں کا آگ لہرانے والا جتوں توں کا کھیل سرد سرد سی فضا کو گرما رہا تھا۔

گنپت یار کے گھاٹ پر چہل پہل کسی بھی صورت کم نہ تھی بیاہیں اور مائیں، دُلہنیں اور دیورانیاں شردھا سے بھرپور، ایک نامعلوم سے سُرتال میں گھاٹ کی سیڑھیاں اُترتیں اور جا کے اُس جگہ رُک جاتیں، جہاں وِتستا کا پانی اُن کے پاؤں چھو جاتا۔ اُدھر وہ جھک جاتیں اور تھوڑے سے پوجا پاٹ کے بعد وٹک راج کو شوراتری کے اِتنے دن بعد وداع کرتیں۔ گوری گنپت یار کے ایک طرف کھڑے چار منزلہ مکان کی کھڑکی کی سِل پر سر رکھ کر یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اور دل ہی دل میں کُڑھتی جا رہی تھی۔ دلہنیں اور دیورانیاں گھاٹ کی سیڑھیاں چڑھ کر اپنے اپنے گھروں کو جا رہی تھیں سہیلیاں مل رہی تھیں۔ اور گلے مِل رہی تھیں۔ کبھی چنچل سی مسکانیں گھاٹ کے آر پار ہو جاتیں اور کبھی حسین سے قہقہے گھاٹ کی فضا کو گدگداتے۔ . . . . اور یہ دیکھ کر گوری اپنے اندر ایک ٹیس سی محسوس کرنے لگتی لیکن آہ ہونٹوں پر نہ آنے دیتی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ تِلا اشٹمی کے تیوہار کو اسی شوخی اور چنچل پنے سے منانے کی حقدار ہونے پر بھی وہ ایسا نہ کر سکی۔ اگر وہ قسمت کی پھوٹی نہ ہوتی تو شادی کے بعد پہلی شوراتری ہی ٹھاٹھ سے اپنے سسرال میں مناتی، مگر شاید گوری اسی لئے پیدا ہوئی تھی کہ اُس کی آنکھوں کے سامنے اس کی اُمنگیں تڑپ تڑپ کر جان دیں اور اس کی زندگی بھاری بن کر اُس کی کمزور روح پر بوجھ بنی رہے۔

گوری نے سُنا تھا کہ تِلا اشٹمی کا تیوہار اُس زمانے کی یاد دِلاتا ہے جب برسوں کی تپسیا کے بعد پاروتی نے شنکر کو پا لیا تھا۔ اور شوراتری کے دن اُن کا بیاہ ہوا تھا۔ اور آج کے دن پاروتی اپنے شنکر کے ساتھ کیلاش پربت کی طرف چل دی تھی تو ہمالیہ کے باسیوں نے شنکھ بجائے تھے۔ دیپ مالا رچائی تھی . . . . . . اور آٹھ مہینے پہلے گوری بھی تو دُلہن بن کر گنپت یار کے گھاٹ کی ان ہی سیڑھیوں سے اُتر کر ناؤ میں بیٹھ کر شنکر کے گھر گئی تھی۔ اُس کے پیاروں نے بھی تو اُس دن اُسے وداع کرتے وقت خوشی کے آنسو بہائے تھے اور گھی کے چراغ جلائے تھے . . . . . مگر گوری اپنے بیاہ کی بات یاد کر کے ذرا بھی نہ کسمائی بلکہ اُسے تو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے اُس کی شادی زمانہ ہوئے ہو گئی ہو اور اُسے یوں محسوس ہو رہا

اپریل مئی ۱۹۵۷ء

تھا کہ جیسے اُس کی زندگی اب اُس منزل پر پہنچ چکی ہے۔ جہاں سے دن گنے جاتے ہیں۔

گوری لچھکر کے گھر تو دلہن بن کر گئی مگر شادی کے تیسرے ہی مہینے بعد ہمیشہ کے لئے میکے لوٹ آئی۔ اس میں قصور گوری کا نہیں تھا اور نہ لچھکر کا۔ وہ دِلی کا شہر ہی ایسا تھا جہاں کی ہوا لگتے ہی لچھکر کی آنکھوں کا پانی ڈھل گیا تھا۔ گوری کو ماں باپ کے سہارے چھوڑ کر لچھکر شادی کے ڈیڑھ ہی مہینہ بعد دِلی گیا تھا دِلی میں کسی دھنی سیٹھ سے ملاقات ہوئی تھی جس نے اُس کو اپنی فرم میں ایک بہت ہی اچھا عہدہ دلوایا۔ لچھکر جو ایک معمولی کلرک کی حیثیت سے گندی سی چال میں سویا تو صبح اپنے آپ کو بزنس ایگزیکٹو کی پوزیشن میں پایا تو دماغ پھر گیا۔ اب لچھکر کی زندگی ایک نئے ہی سانچے میں ڈھلنے لگی تھی اور اُس کا تصوّر اس بات سے مطمئن ہی نہ ہو رہا تھا کہ اَن پڑھ گوری اُس نئے ماحول میں کبھی رس سکتی ہے بس سکتی ہے! لچھکر اپنی نئی زندگی میں ایک خلا محسوس کرنے لگا۔ اور اسے پُر کرنے کی غرض سے اُس نے دلی میں ہی ایک نئی شادی رچائی اور اَن پڑھ گوری سے ناطہ توڑ دیا۔ اس پر گوری کے ماں باپ نے مقدمہ دائر کیا۔ اور بڑی لے دے ہوئی۔ آخر کو یہی فیصلہ ہوا کہ لچھکر گوری کو ماہوار بیس روپیہ بھیجا کرے۔ اور گوری کے ماں باپ نے تقدیر کے سامنے شکست کھا کر اس بات کو مان لیا اور اپنی بیٹی کو ہمیشہ کے لئے میکے بُلا لیا۔

گوری کے دل پر جو گھاؤ پڑ گیا وہ بھلا بیس روپوں سے کیا بھر جاتا، وہ اندر ہی اندر گھلتی جاتی تھی، مرتی جاتی تھی۔ خیرخواہوں نے مشورہ دیا کہ گوری کو اب تعلیم حاصل کرنا چاہیئے۔ تاکہ اپنی ٹانگوں پر کھڑی ہو جانے کے قابل ہو سکے اور ماں باپ پر بوجھ نہ بنی رہے اس طرح اور بھی مشورے ہمدردوں سے مِلے۔ لیکن گوری کو چاہیئے تھا اپنے شوہر کا پیار، دُلار جس کے انتظار میں اُس نے اپنی زندگی کے اٹھارہ سال بتائے تھے۔ پیار مِلا تو وہ بھی ایسا جیسے گھنے بادلوں کی اوٹ سے بجلی کا کوندا، جس سے ایک لمحہ کے لئے روشنی تو مِل گئی مگر ساتھ ہی آشیاں بھی جل گیا۔ گوری دوش دے نرگس کو دے۔ لچھکر کو وہ اب بھی اپنا شوہر مانتی تھی۔ اس کی نئی بیوی کتنی پڑھی لکھی سہی آخر عورت ہی تو تھی۔ بُرا ہو صرف اُس کو عہدہ مِلنے کا جس کے کارن اُس کا دماغ پھر گیا۔ گوری دل ہی دل میں اپنی خوشیوں کے سوتے سوکھ جانے پر اسی طرح کی اوٹ پٹانگ باتیں سوچتی رہتی۔ لوگ اُسے کہتے تھے کہ لچھکر اب تمہارا کبھی نہیں ہو سکتا، اس لئے اُس کا خیال دل سے نکال ڈالو۔ مگر گوری ایسا کر بھی لے پھر —— اٹھارہ برس کی جوان عورت اس بے درد دُنیا میں کیا کرے۔ کہاں جائے، جو اُسے دیکھیگا یہی کہے گا، دیکھو اسے شوہر نے چھوڑ دیا ہے۔ کلنک جو لگ گیا سو لگ ہی گیا۔ اب کس کو پڑی ہے جو اس بات کی جانچ کرتا پھرے۔ کہ اس معاملے میں گنہگار کون ہے۔ مگر گوری کو دیکھتے ہی لوگوں کو جو پہلی بات یاد آئے گی وہ یہی ہوگی کہ اسے شوہر نے چھوڑ دیا ہے۔ اب وہ میکے سے باہر ایک قدم نہیں رکھ سکتی۔ کچھ لوگ بے چاری سمجھ کر ہمدردی کی آڑ میں اس کی جوانی کو گھورنے لگیں گے۔ اور پھر اس کے ہر قدم پر اُنگلیاں اُٹھنے لگیں گی اور . . . .

کھڑکی کی سِل پر سر رکھ کر گوری کا دماغ یہ سب سوچتے سوچتے تھک سا گیا تھا۔ آنکھوں میں نمی سی آ چکی تھی اور رات نِکل رہی تھی۔ نیچے گنپت یار کے گھاٹ پر عورتوں کا آنا جانا اب بالکل ہی تھم گیا تھا۔ شور بھی مدھم پڑ گیا تھا۔ گھاٹ پر صرف بچے تھے جو ابھی بھی اپنے جنتوں توں کے کھیل میں مگن نظر آ رہے تھے۔ بہت سارے بچے تو اپنی کانگڑیوں کے خول میں پھوس بھر رہے تھے، رسیاں باندھ رہے تھے آگ لگا رہے تھے۔ ننھے ننھے بچوں کو پھرتی سے آگ لہراتے دیکھ کر گوری کا کلیجہ سہم جاتا اور اس کی نظریں جنتوں توں کھیلتے ہوئے بچوں کے گرد بنتے ہوئے آگ کے دائروں کا برابر تعاقب کرتیں اور پلک تک نہ جھپاتی کہ کہیں ایسا نہ ہو کسی نونہال کے بدن کو چنگاری لگ جائے! گھاٹ سے اِتنے فاصلے پر بیٹھنے کے باوجود بھی گوری جیسے اِن بچوں کے پاس ہی بیٹھی، ان کی حفاظت کر رہی تھی۔ کبھی کوئی منچلا سا بچہ کانگڑی کے جلتے ہوئے خول کو زور زور سے گھُماتا تو وہ ایسا محسوس کرتی کہ آگ چھپا کے میں آس پاس

کھڑے بچوں کو مس کرے گی ہی، نہیں تو کانگڑی کے خول سے رسی ٹوٹ ہی جائیگی اور جلتا ہوا خول ساتھ والے کسی مکان کی چھت پر آ ہی گرے گا اور محلے میں آگ لگ ہی جائیگی!

رات بیتی جا رہی تھی۔ وِتستا کے چراغ بجھ بجھ کے سو رہے تھے۔ فضا میں سردی کی وجہ سے سکڑان سی پیدا ہو گئی تھی۔ مگر گوری ابھی تک سوچ ہی رہی تھی کہ نو بیاہتا دُلھنیں اپنے سسرالوں میں اس وقت کیا کر رہی ہونگی! وہ تھا وقت اپنے شوہروں کی گودیوں میں سر رکھ کر آنے والی خوشیوں کے سپنے دیکھنے کا مگر ایک گوری تھی جس کے حصّے میں یہ سب کچھ نہیں آیا۔ اُسے اپنی زندگی پر بڑا افسوس ہو رہا تھا۔ آخر اُس کی زندگی کا کیا ہوگا، اُس کی جوانی کا کیا ہوگا۔ یہ سوال بار بار اُس کے ذہن میں آ جاتے اور ان کے آگے وہ کچھ سوچ ہی نہ سکتی۔ جب پاروتی کو شنکر کا پیار حاصل نہیں تو وہ ہمالیہ کے برفیلے تودوں میں اپنی قبر کھود کر ہمیشہ کے لئے یخ بستہ کیوں نہیں ہو جاتی! شنکر کے بغیر پاروتی کا نام جیسے زبان پر چڑھتا ہی نہیں۔ اسی طرح اگر گوری کو شنکر کا آسرا نہیں ملتا تب کیا جینا کیا مرنا۔ اس طرح وہ سوچتی جا رہی تھی کہ نیچے گھاٹ سے ننھے رتن کی آواز آئی۔ 'دیدی، دیدی، دیکھو نا، یہ لوگ مجھے جنتوں توں کھیلنے نہیں دیتے۔ کہتے ہیں اپنی کانگڑی کا خول نہیں دے دو، ہم لہرائیں گے'۔ گوری چونک گئی۔ دیکھا تو گھاٹ کی پتھریلی سطح پر بچوں نے جھگڑا شروع کیا تھا۔ رتن سے کوئی دوسرا بچہ اس کی کانگڑی کا خول چھینے جا رہا تھا۔ گوری نے کھڑکی سے ہی للکارتے ہوئے کہا، 'خبردار، جو میرے ننھے بھیا سے کانگڑی کا خول چھین لیا۔ یہ اپنے ہی ہاتھوں سے خول لہرائے گا'۔

اور یہ کہہ کر گوری جلدی جلدی گھاٹ پر اُتر آئی اور گھاٹ پر آتے ہی ننھے رتن کو دلاسا دے کر اس کی کانگڑی کے خول میں اچھی طرح سے پھوس بھر دی، کس کے رسی باندھ لی، اور پھوس کو آگ دکھا کر رسی رتن کے ہاتھ تھما دی۔ لیکن جونہی آگ بھڑک گئی رتن اسے لہرانے سے ڈر گیا۔ اور اُس نے گوری کی طرف رسی بڑھا کر کہا۔

دیدی تم ہی میرے بدلے جنتو توں کھیلو، میں دیکھونگا تم کیسے لہراؤ گی۔

گوری نے رسی تھام لی۔ اور دور سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرکے رتن کو اُدھر ہی بیٹھ کر تماشا دیکھنے کے لئے کہا اور خود دائیں ہاتھ سے ایک لمبی سی رسی پکڑ کر جلتی ہوئی آگ لہرانے لگی۔

گوری اپنے اردگرد آگ گھمانے لگی اور گھماتے گھماتے اس گھماہٹ کے ساتھ ساتھ اندھے سے سُر میں جنتوں توں کے بول بھی گانے لگی۔ رتن گوری کو آگ لہراتے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا، مچل رہا تھا۔ گوری یہ سب دیکھ کر بھی نہ دیکھ رہی تھی۔ اور کچھ سوچ رہی تھی کہ اک دم سے پلٹ گئی اور وِتستا کی طرف مُنہ کرکے اندھا دُھند شعلے لہرانے لگی۔ آگ گھمانے لگی۔ وِتستا کے پانیوں میں لہراتے ہوئے آگ کے تھرتھراتے ہوئے عکس اُبھرنے لگے۔ گوری نے گھومتی ہوئی آگ کی رسی چھوٹی کر دی۔ اب شعلے اس کے قریب رقص کرنے لگے۔ رتن سیڑھیوں پر کھڑا ہو کر گوری کی اس عجیب حرکت سے گھبرا اُٹھا۔ اُس نے پکار کر کہا۔

"دیدی رسی لمبی چھوڑ دو، تمہارے کپڑوں کو چنگاریاں لگ رہی ہیں"۔

گوری نے اس کا جواب کچھ نہ دیا اور رسی کو اور قریب سے پکڑا اور بے تماشا آگ لہرانے لگی۔ سب بچے سہم گئے اور رتن نے پھر آواز دی۔

"دیدی تم کو کیا ہو گیا ہے۔ چھوڑ دو رسی کو، چھوڑ دو۔ اب میں نے دیکھ لیا۔ تم کیسے لہراتی ہو۔ بس کرو دیدی میں ڈر رہا ہوں"۔

"تم ڈرو نہیں بھیا، دیکھتے جاؤ۔ دیکھ رہے ہو نا میں جنتوں توں کیسے کھیل رہی ہوں۔ دیکھتے جاؤ۔" گوری کی آواز وِتستا کے دونوں کناروں سے ٹکرا کر گونج اُٹھی۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے دائیں بازو کی کلائی اور بھی تیزی سے گھومنے لگی، گھومنے لگی اور خود گوری بھی گھومنے لگی —— گوری شنکر کا تانڈو ناچ ناچ رہی تھی۔ اس کی کائنات کے زمین و آسمان مل رہے تھے، اس کی زندگی کا گھنیرا بن رات کی سیاہیوں میں تیزی سے مل (بقیہ صفحہ نمبر ۸۳)

اِنتخاب

کسی شعری تخلیق کو دوسری زبان میں اپنی مخصوص فضا اور اصلی روح کے ساتھ منتقل کر دینا تقریباً ناممکن ہے۔ ہر زبان کی شاعری کا ایک خاص ماحول، مزاج اور آہنگ ہوتا ہے۔ اور دوسری زبان میں ترجمہ کرتے وقت خیال کو تو اس زبان میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ مگر اس ماحول، مزاج اور آہنگ کو بعینہٖ منتقل کر دینے کی کوشش کرنا سعیٔ لاحاصل ہے۔

ہجورؔ کی چند نمائندہ تخلیقات کو اردو ترجمے کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس اعتراف کے ساتھ کہ ترجمہ بھی ایک فن ہے۔ اور مترجمین اس فن میں ماہر نہیں، اس لئے وہ صرف بنیادی خیال کو اردو کے قالب میں ڈھال سکے ہیں۔ اس کیفیت کو منتقل نہیں کر سکے ہیں جو خیال کو شعر بنا دیتی ہے۔

ہزار نکتہ دریں کاروبارِ دلداریست

(شانِ نزول)

سنگرمالن پیٗو پراگاش

[سنہ ۱۹۵۲ء میں مہجورؔ مرحوم نے ریڈیو کشمیر سرینگر کے بچوں کے پروگرام میں اپنی مشہور نظم "سنگرمالن پیٗو پراگاش" شانِ نزول اور پس منظر کے ساتھ سنائی تھی۔ ذیل میں شاعر کے بیان کردہ شانِ نزول کو ترجمہ کے ساتھ درج کیا جاتا ہے]

بو بوزہ ناوٗہ تو یہ پننٕ وننت اکہ کاشر بیتھاہ۔ یہ بیت چھوا زکہ برونہہ کینہہ ورِیہ ونہ آمُت۔ گوڈہ ونوہ بو توہہ زہ یہ بیت کمن حالاتن منز کہتہ پاٹھہ چھو وُنہ آمُت۔

اکس شاعرس یعنی گونہ ماتہس یلہ کانہہ واقع یتھہ پیش چھہ یوان۔ تہ تہندس دلس چھہ اثر کران۔ تہ آتی چھہ سو شاعر بیتن منز سو واقع پیش کران۔ تتھہ چھہ کاشر پاٹھہ ونان "وزُن"۔ فارسی یا عربی پاٹھہ تتھہ ونان الہام۔ یلہ شاعرس "وزِنہ" چھہ لگان تہ چھہ بیت ونان۔ اکثر چھہ تمن بیتن اندر اشارہ پاٹھہ یا مختصر پاٹھہ تمہ کتھہ تہ یوان۔ یم نہ تمہ وقتہ چھہ ظاہر سپدان۔ یا یمن ہندہ جلدی ظاہر گژھنک چھونہ کانہہ امکان آسان۔ مگر شاعرہ سند دونمت چھُ پورہ سپدان سو فیصدی۔

سانِس ملکس اندر یلہ انگریزو سارِن نیشنل کانفرنسک لیڈرہ ساری گرفتار کرِتھ جیلن اندر سختی ہند دوہ بسر کران۔ کینہہ کالاہ گژھتھ تراوک قیدک میعاد پورہ گژھتھ سان لیڈر۔ زہ دوہ برونہہ ہوت کاشرو تہندہ استقبالچ تیاری کرن۔ لوکن ہیوہ ند جوش، خوشی، شوق، استقبال وچھتھ گوس بو سٹھاہ متاثر۔ امہ برونہہ اکہ زہ دوہ آس کینہہ دوست تمیت ملاقی سپنمت۔ یمو دوپ ساتو امو لیڈرو کرِ پنن زندگی خراب۔ ناممکن چھُ زہ یم گژھن کونہ دوہ کامیاب۔ یم چھہ تہ ونان یہ زاہ تہ پنہ۔ یمہ نے حالاتن اندر گو میانہ زوہ پیٹھہ یہ شعر جاری؎

گٹہ ژلہ گاش یہ گاٹُ تراوٗ لالن سنگرمالن پیٗو پراگاش

سنگرمالن، کوہن تہ بالن سنگرمالن پیٗو پراگاش

امیٹھن شعرن ہوند نظم گو تیار۔ مگر ستے شعر دراے نبر۔ اٹھم شعر رُود ونکتام پوشیدہ؎

سو گو یہ؎ بو نہ یتھہ گاٹہ ہوند اول یلہ وان ۔ بلبلن ییدہ گژھہ بچرچ آش
پوشِ پن ہوش تیہ دم سنبالن ۔ سنگرمالن پیٗو پراگاش

دن بو زو تو ہہ سو روی بیت؎ گٹہ ژلہ گاش آد ... ...

مہ چھوہ پننو دنمتو نظمن منز یہ نظم امہ کتہ زیادہ پسند۔ زہ ادل گوس بو استقبالک تصویر پیش کرنس منز کامیاب۔ دوییم سپنہ میانہ پیش گوئی برابر۔

(ترجمہ)

میں تمہیں اپنی کہی ہوئی ایک کشمیری نظم سُناتا ہوں۔ یہ نظم آج سے کچھ برس پہلے کہی گئی ہے پہلے میں تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ نظم کن حالات میں اور کیسے کہی گئی ہے۔

ایک شاعر کو جب کوئی ایسا واقعہ درپیش آتا ہے جس سے اُس کا دل متاثر ہوتا ہے تو وُہ شاعر نظموں میں اُس واقعے کو پیش کرتا ہے۔ اُس کو کشمیری زبان میں "وزن" (لفظی معنی اُبلنا) کہتے ہیں۔ اور فارسی اور عربی میں اسے الہام کہتے ہیں جب شاعر پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے اُس وقت وُہ نظم کہتا ہے۔ ان نظموں میں اشارتاً یا مختصر طور ایسی باتیں بھی بیان ہوتی ہیں جو اُس وقت ظاہر نہیں نظر آتیں۔ یا جن کے جلدی پورا ہونیکا کوئی امکان نہیں ہوتا مگر آخر پر شاعر کا کہا ہوا سو فیصدی پورا ہوتا ہے۔

ہمارے ملک میں جب انگریزوں نے نیشنل کانفرنس کے تمام لیڈروں کو گرفتار کر لیا اور وُہ جیلوں میں مشکلات کے دن بسر کرنے لگے۔ کچھ عرصہ کے بعد قید کی معیاد پوری کرنیکے بعد ہمارے رہنما رہا کر دیئے گئے۔ دو دن پہلے کشمیریوں نے ان کے استقبال کی تیاریاں شروع کر دیں۔ عوام کا جوش، مسرت، شوق، استقبال دیکھکر میں بہت متاثر ہوا۔ اس سے ایک دو دن پہلے کچھ دوست مجھ سے ملے تھے۔ انہوں نے کہا ان لیڈروں نے اپنی زندگیوں کو تباہ کر دیا ہے۔ یہ بات ناممکن ہے کہ وُہ کسی دن (اپنے مقصد میں) کامیاب ہو جائیں (یہ دن رہتا) ایسی باتیں کہتے ہیں جن کے پورا ہونیکی کوئی صورت نہیں۔ ان ہی حالات کے پس منظر میں میری زبان پر یہ شعر جاری ہو گیا؎ ظلمت کے بادل پھٹ جائیں گے۔ نور کی سواری آئیگی۔ لالہ نے روشنیاں بکھیر دی ہیں۔ اور پہاڑ ان روشنیوں سے جگمگا اُٹھے ہیں۔ اور اسطرح سے آٹھ بند کی یہ نظم تیار ہو گئی۔ مگر اُس وقت صرف سات بند عوام کے سامنے آئے۔ آٹھواں بند ابتک پوشیدہ رہا۔ جب چنار سے چیل کا گھونسلا اُتارا جائیگا۔ جب ہی بلبلوں کے جینے کی اُمید پیدا ہو جائیگی۔ اور اُس وقت گلستان کے پھول ہوش میں آ کر شگوفہ کا سانس لیں گے۔ پہاڑ نئی روشنی سے جگمگا اُٹھے ہیں)۔ اب تم ساری نظم سنو۔ مجھے اپنی کہی ہوئی نظموں میں یہ نظم اسلئے زیادہ پسند ہے۔ کہ اول تو میں استقبال؎ (استقبالیہ جذبات) کی تصویر پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسرے میری (اِس نظم میں) کہی گئی پیش گوئیاں پوری ہو گئیں۔

مہجور

اپریل ۱۹۵۷ء

سنگر مالن .....

گنڈ ژالہِ گاش بیہ گاہ ترود لالن   سنگر مالن بیوِ پراگاش
سنگر مالن کوہن تہ بالن
سنگر مالن بیہ پراگاش

باغکِ ریزنِ وارلین گالن   بلبلہ غم تراد کڈ بکھن واش
بیتہ پیر چونی مذہب پالن
سنگر مالن بیوِ پراگاش

ہر ڈک طوفان پشہ نکھرہ ژالن   سونتھ بیہ دومہ اکہ تنکہ پر خاش
شموہ پھولہِ تن لیس دیہ جھجالن
سنگر مالن بیہ پراگاش

گلالہ لولچہ شالہ زالن   تمہ نورہ روشن گھرہ آکاش
مس ول شبنمکِ مس پھرہ پیالن
سنگر مالن بیوِ پراگاش

گل آفتابن مُہرہ لزہ تھالن   لولکہ اسمانہ ہیتھہ آوراش
اِسپند زولس اِم گلالن
سنگر مالن بیوِ پراگاش

مانہِ ژار مہجورہ سنزن ہٹالن   نہ نرتھہ وِنہ ہے بہر گرتھہ فاش
دانا بوزن تہ نادان نالن
سنگر مالن بیوِ پراگاش

ترجمہ

ظلمت کے بادل چھٹ جائیں گے۔ نور کی سواری آئے گی۔ گل لالہ کی مشعل فروزاں ہوگئی ہے۔ اور کوہسار اس کے نور سے جگمگا اُٹھے ہیں۔

چمن کے محافظ شکاری پرندوں کو ہلاک کر دیں گے۔ بلبل! سُکھ کا سانس لے کر محوِ پرواز ہو۔ اب سے تو وہی قانون چلے گا جو تیری پسند کا ہو۔ کوہسار نور سے جگمگا اُٹھے ہیں۔

خزاں کی مسموم ہوائیں کیاریوں کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گی۔ ایک دن بہار آکر ان پر نکھار لائیگی۔ اُس وقت وہی مُسکرا اُٹھیں گے۔ جو آگ میں پڑکر کندن ہوگئے ہوں۔ کوہسار نئی روشنی سے منوّر ہوگئے ہیں۔

صحرا کے پھول محبت کی قندیلیں روشن کریں گے۔ اور اُس نور سے آسمان تابندہ ہو اُٹھے گا۔ اور نرگس شبنم کی شراب سے پیمانے لبریز کر رکھے گی کوہسار طلوع ہونے والی روشنی سے جگمگا اُٹھے ہیں۔

گل آفتاب (ایک پھول) نے اشرفیوں کے تھال سجا رکھے ہیں یہ سوغات پرچم کے ساتھ آئی ہے۔ لالہ نے عود عنبر جلا کر اس کی پیشوائی کی ہے۔ کوہسار طلوع ہونے والی روشنی سے جگمگا اُٹھے ہیں۔

مہجور کے استعارے معنی طلب ہیں۔ وہ واضح الفاظ میں کہتا، تو راز راز نہ رہے گا۔ عقلمند سمجھ جائیں گے۔ اور نادان سمجھنے کی کوشش تک نہ کریں گے۔ کوہسار نئی روشنی سے جگمگا اُٹھے ہیں۔

ژولہما روشہ روشے

ژولہما روشہ روشے
پو شے متہ جانانو
اتی اتی روز تو یارو   کتوٗ ژلکھ جادوگارو
گوڈہ کر میبو لزہی چارو
پو شے متہ جانانو
بال بیٹھ بال چھس پراران   اشہ کنہ خون چھس ہاران
یارس مار مٹھ کھاران
پو شے متہ جانانو
یکھنا حالِ دل باوئے   دودمُت سینہ ہا ہاوئے
تیسلہ یکھا یلہ بو راوئے
پو شے متہ جانانو
ونہ بیٹھ ژولہم تراوِتھ   جگرس آمہ تاوُ تھاوِتھ
یم داد کسو ہیکہ ہاوِتھ
پو شے متہ جانانو
شرہہ ژلہ ہم پانس   بہتو ڈیہ ڈالانس
لگہ یو سورِہ سامانس
پو شے متہ جانانو

ترجمہ:-

تم دھیرے دھیرے بھاگ کر کہاں چلے
پھولوں کے متوالے ساجن۔
محبوب۔ وہیں ٹھہر جا۔ مجھے چھوڑ کر کہاں جاؤگے۔
پہلے میرا انجام تو سوچ لے۔
پھولوں کے متوالے میرے ساجن۔
میں کوہسار پہ بیٹھی محوِ انتظار ہوں۔ اور اشکوں کے بجائے خون برسا رہی ہوں۔
میرا خون تیری گردن پر ہوگا۔
پھولوں کے متوالے میرے ساجن۔
آجا! تمہیں دل کا حال سُناؤں۔ اور جلے ہوئے دل کے پھپھولے دکھاؤں۔
تب آنے کا کیا فائدہ جب میں کھو جاؤں۔
پھولوں کے متوالے میرے ساجن۔
تو مجھے زندگی کے چوراہے پر چھوڑ کر چلا گیا۔ اس حال میں کہ قلب و جگر اس بیوفائی سے کباب ہوگئے تھے۔
یہ زخم میں کس کو دکھلا سکوں گی۔
پھولوں کے متوالے میرے ساجن۔
میرے دل کے ارمان نکل جاتے۔ کاش تم بارہ دری پر جلوہ گر ہو جاتے
میں تیری اداؤں پر واری ہو جاؤں۔
پھولوں کے متوالے میرے پیار!

بالہ پیٹھہٕ لایئے نادو   پتھ پھیرِو ہا شاہزادو
موژل گوڈہٕ پال وعدو
پوشے متہٕ جانانو

ریکھ لیکھ گراوہ ہا سوزیئے   ہا بو نو یم بہانہ بوزیو
دعوے اگیہ ہا روزیئے
پوشے متہٕ جانانو

وولئے ولیس گژھ ویئے کامے   یاڑ ہے کرنس تھامے
گائِجہ نس تہ لاجہ نس پامے
پوشے متہٕ جانانو

وولیئے ولیس گژھ ویئے ون تہٕ   تسَ کمی برہ نم کنَ تہٕ
کرسنا بیہ ڈلیشن تہٕ
پوشے متہٕ جانانو

عشقن کرسہ بدنامو   کر یچھ گیہ شہر تہ گامو
پتر بیہ چھم دیوان پامو
پوشے متہٕ جانانو

میں بلندیوں پر سے تجھے پکاروں گی کہ اے میرے دل کے مالک لوٹ کے آ۔
جب تک وعدہ پورا نہ کرلو۔ مجھے چھوڑ کے نہ جانا۔
پھولوں کے متوالے میرے ساجن۔

میں شکووں کے دفتر لکھ لکھ کے بھیجوں گی: کوئی بہانہ مجھے بہلا نہیں سکتا۔
تیرا دامن تو مجھ سے کبھی نہیں چھوٹ سکتا۔
پھولوں کے متوالے میرے ساجن۔

آ سکھی! اب کوئی کام تو کرنا ہی ہوگا۔ محبوب نے تو مجھے سحر زدہ کر دیا
اُس نے مجھے مار ڈالا ہے اور دُنیا مجھے طعنے دے رہی ہے۔
میرے پھولوں کے متوالے ساجن۔

آ سکھی! جنگل میں اُسے تلاش کریں وہ مجھ سے بدگماں کیوں ہوگیا ہے۔
کیا اب میں اُسے پھر دیکھ سکوں گی۔
پھولوں کے متوالے ساجن کو۔

عشق نے مجھے بدنام کردیا ہے۔ شہر اور گاؤں میں میرا ہی چرچا ہے
اور سوکنیں مجھ پر طنز کے وار آزما رہی ہیں۔
پھولوں کے متوالے میرے ساجن!

ہجور ون دیوان یارس   بے وفا بازی گارس
دیتہ س کوت کالی پرارس
پوشے متہٕ جانانو

(ہجور محبوب کی راہیں دیکھ رہا ہے اُس بے وفا شعبدہ گر کی۔
اُسے کہو، کب تک انتظار کراؤ گے۔ میرے پھولوں کے متوالے ساجن
کو!)

تمنّا چھانہٕ دیدارُک .....

تمنّا چھانہٕ دیدارُک مےٚ چھُم ہمبر زلے بمبرو
وچھس یامت لجس وُچھنے گچھس چانے کلنے بمبرو

یہ قد چون زن چھُہ پوشے گل ژُلے برجستہ چھُس بالکل
وُچھتھ سنبل تہٕ رنگین گُل یہ دِل ماتنبلے بمبرو

وُچھک دُورے مہٕ مستورے دِلک ہرژ مہٕ تھوُم ژُورے
ژہٕ لوُ پُھتھ تیر زن ژُورے یہ چھوکھ زاہ نو بلے بمبرو

کھٹِتھ روُدُک مَےٚ ن وارہ بدن مےٚ زو لتھِم نارہ
وُدن چھس چانہٕ امارہ یہ دِل کرٕ شہلے بمبرو

ژہٕ یارن سیتہٕ ژوٚہ ماران بہٕ تنہا خونِ دِل ہاران
دوٚہس کوت نیرہ چھس ہاران ولس ژھانڈ راتنلے بمبرو

ژہٕ کس سیتی گَیئ سازش دیم چھا بیاکھ کانہہ ہمش
ژہٕ میانے رشکہ پانس نش رنگُک کٔرِہ سو لنے بمبرو

یہ ہنا حالِ دل باوئے گچھہ کوٚٹھہ تو سہ وتھراوئے
یمن زوٚ پیشکش تھاوئے مہٕ پانس شرژ لنے بمبرو

یہ پرس یارہ کمہ چوُوک ژہٕ غیرن سیتہٕ ملہ نووُک
کرِتھ تعویذہ برم روُدک کمیہ آرہ ولے بمبرو

کران ہجور چھُنس گتھہ وَنان یارس بتہ اک کتھہ
یہ دل دیوانہ گوژھے پتھ بنیس سیتہ نو رلنے بمبرو

ترجمہ:-

بھنورے ! نرگس کو تمہاری دید کا ارمان ہے۔

جونہی میں کھلی۔ میری نگاہیں تیری راہیں تکنے لگیں۔ اور تیرے ہی تصور میں نڈھال ہوتی رہی۔

تیرا پیکر ایک رواں دواں پھلواری ہے جو اپنی بہار پر آچکی ہو۔

گلوں کا یہ رنگین اجتماع دیکھکر کہیں یہ دل مچل اُٹھے۔ تو کیا ہو؟

نقاب کے اندر رہی میں نے تمہیں دُور سے پہچان لیا۔ مگر اس دِل کا حال تمہیں نہ سُنا سکی۔

تم نے مجھے جو زخم بخشے ہیں وہ کبھی مندمل بھی ہو سکتے ہیں میرے بھنورے :-

حسینوں کو بھانے والے ! تیرے فراق میں میں ہجر کی آگ میں جلتی رہی۔

تمہارے لئے میری آنکھیں ساون بھادوں بنی رہیں۔ کاش میرے دِل کا الاؤ ہی بجھ پائے۔

تم دوستوں کے جھرمٹ میں نغمہ سرا ہو۔ اور میں تنہا بیٹھی خون کے آنسو رو رہی ہوں۔

میں تجھے دن دھاڑے ڈھونڈتی مگر آہ ! مجھ پر خوف سے لرزہ طاری ہوتا ہے اب میں رات کے اندھیاروں میں تجھے تلاش کروں گی۔

کس نے تیرا من موہ لیا۔ کیا آکاش کے نیچے میرا کہیں جواب ہے؟

یا کہیں میرے رشک میں کسی نرگس نے ہی کہیں تجھے اپنی باہوں میں تو نہ لے لیا؟

آبھی جا ! میرے من کی بیتی سن لے۔ تیرے لئے میں گھر کے سب سے اچھے کمرے میں پشم کا بستر سجا رکھوں گی۔
اور اپنی جان تیرے سپرد کر کے دِل کا غبار نکال لوں گی۔

نہ معلوم کس کے یہاں تو نے شراب پی لی اور اُسی کے ہو رہے۔

نہ جانے کس نازنین نے جادو گنڈے کے زور سے تجھے بہکا دیا۔

ہجور شمع حسن کے گرد پروانہ وار محو طواف ہے۔ اور کہا جا رہا ہے یہ دِل جو تمہارا دیوانہ ہے۔ کسی دوسری طرف آنکھ تک نہیں اُٹھا سکتا۔

وُزملہ

نازہ تنہٖ ہم ووزلِ جامہ کم ولہٖ یے   نُورہ وُزہ ملہٖ یے وارہ ھاوٚ یان
نُورہ وُزہ ملہٖ یے پُورہ نازلہٖ یے
نُورہ وُزہ ملہٖ یے پُورہ ہاوٚ یان

جلوا ہووُتھ پیٹھ اہرہٖ بلہٖ یے   شہرہ تےٚ گامہ گو شور یکسان
پریمہ رس باگہ ران وژہ کھےٚ کھنہ بلہٖ یے
نُورہ وُزہ ملہٖ یے پورہ ہاوٚ یان

شامہ ژھایہ ابرہ دار جامہ ولہٖ یے   وارٚ نیتھ چھک پھیرتھ گرٛھان
بیہٖ چھک مالِنُن گرٛھان ژلِ ژلہٖ یے
نُورہ وُزہ ملہٖ یے پُورہ ہاوٚ یان

درشُن ہووُت پردٚس تلہٖ یے   نظرہ اکہٖ وُچھتھ سورُے جہان
پان ژھایہ تھووُتھ بیہٖ ژلِ ولہٖ یے
نُورہ وُزہ ملہٖ یے پُورہ ہاوٚ یان

زِنہ مک سِر وونی کمی گاٹلہٖ یے   سادِہ نِیُن کرُت چھُنہ یہ سمسار جان
تی وُچھت پیتھ سیوٚ تُھ ہمبرزلہٖ یے
نُورہ وُزہ ملہٖ یے پُورہ ہاوٚ یان

جان نےٚ یہ عالم زونتھ رنگہ ولہٖ یے   پھیر پھیر کیازہ چھکھ ژورکُن وُچھان
دِرسہ کُس لوٚب چھُوی کران مَس ولہٖ یے
نُورہ وُزہ ملہٖ یے پُورہ ہاوٚ یان

ترجمہ:-

تیرے نازک پیکر کو یہ سُرخ پہناوا کس نے پہنایا۔
اے نُور کے کوندے - پوری طرح تو سامنے آ۔

تم نے اہرہ بل کی بلندیوں پہ جلوہ دکھایا۔ شہر اور گاؤں یکساں طور گونج اُٹھے۔
تو کھنہ بل کی طرف سے محبت کی شراب برساتی آئی۔ اے نُور کی دیوی

تم شام کے دھندلکے میں بادل کے جامے اوڑھے پیا ملن کو نکلتی ہو۔
اور پیا کے گھر سے بھاگ بھاگ آتی ہو۔ اُس کے بعد پھر میکے کی راہ لیتی
ہو - اے نور کی دیوی۔

پردے کے نیچے سے دیدار دکھاتی ہو۔ اور ایک ہی نظر سے تمام دنیا کا نظارہ
کر لیتی ہو۔ اور اُس کے فوراً بعد پھر خلوت کی پہنائیوں میں کود جاتی ہو - نور کی
دیوی۔

زمانے کا یہ راز کسی عقلمند نے فاش کیا ہے کہ پری پیکروں کے لئے اِس
ظالم جہاں کی آب و ہوا ٹھیک نہیں - اے نور کی دیوی۔ شاید اِسی لئے تم نے
وجود کا پیکر پسند نہیں کیا۔

ہاں اگر تجھے یہ دُنیا نہیں بھائی۔ تو پھر آنکھ مچولی کا کھیل کیوں کھیلتی ہو۔
کون سا ارمان تیرے دِل کے تاروں کو رہ رہ کر مرتعش کر رہا ہے دیوی!

ملالہ تراوِتھ ....

ملالہ تراوِتھ ژہ سالہ یِکھنا بو پیالہ مَسہ کی بَرَسے ہا لالو
خیالہ چانے مہ دِل چھُ توشن بو مالہ پوشن گَرَسے ہا لالو
نسیمہ بُوزُم ژہ بالہ دامِن کمند ہیتھ چھُک شِکار ژھاران
بہِ شوقہ چانے شِکارہِ اندر پَنُن یہ سَر ہیتھ تَرَسے ہا لالو
چھِ جل تہ کستوٗر سوزہ ہیانے فراقہ چانِک یہ سازوایان
یہ زیرہ بم کُس ژہ بوزہ نادان بو بال یُدوٗے مَرَسے ہا لالو
بہِ شراوِنچ ہی فوِجس وَنن منزٕ وُچھان رُوزس بو نبہ چانے
وُچھت نہ ہارِک بہار میونوی ون داوہ ہَردَ نہ ہرَسے ہا لالو
ژہ ژھایہ رودُک بو ضایعہ کرِتھس رُٹھتھ ملالہ وَنوٗہی ژہ کم کیا
بہِ نیرہ ژے پیتھ کران گدائی بو نو جدائی زرَسے ہا لالو
مہ چُونہ سنبراوہِ خونِ دِلہ چے رچھان روزس بو رات راتس
تھویم سنبھالِتھ نشانہ باپت تمے ژہ نالَس جَرَسے ہا لالو
بہِ نیرہ نِن یا ڈِھ باوہ لوکن کَنَدِ امارن مہ زاُج ہَن ہَن
نہ کھہِ ژہ پاسن کتھن اولامن نہ کینہ شَترَس ڈرَسے ہا لالو
گُمژ نیبرِ زِل فِراق چھاوِتھ دوبارہ آیِش بو لولہ چانے
وَندَے اچھن منڈ بو گاش یادن دوبارہ لولاہ بَرَسے ہا لالو
وَنان چھُ مہجور ژہ روشہ یِکھنا دماہ بہکنا کتھاہ کرِکھنا
بہِ یانہ شاہانہ سازوایئے ترانہ نو نو یِرَسے ہا لالو

ترجمہ:-

آ! بے رُخی چھوڑ دے، میرے بلاوے پر آ، میں تیرے لئے شراب کے پیالے سجا رکھونگی
میرے محبوب تیرے تصور سے ہی میرا ویراں دل شاداب ہو اُٹھتا ہے میں پھولوں کے ہار گوندھ رکھونگی

همه آہوانِ صحرا سرِ خود نهاده بر کف
به اُمید آں که روزے به شکار خواہی آمد

جل اور کستور (پرندے) میرے سوزِ فراق کی شدّت سے نغمہ سرا ہیں۔
یہ سوز و ساز تم کیسے سُن سکو گے۔ اگر میں کھو گئی میرے محبوب۔
میں یاسمین کے پھول کی طرح جنگلوں میں کھلی اور تیرے انتظار میں راہیں تکتی رہی
تم میرے شباب کی بہار نہ دیکھ سکے۔ اب تو میں بادِ خزاں سے مرجھائی جا رہی ہوں
تم مجھ سے چھپے رہے میں کھلا گئی، تم کیوں روٹھ گئے؟ تمہاری بدگمانی کس لئے ہے؟
میں تیرے لئے صحراؤں کی خاک چھانوں گی۔ یہ جدائی تو مجھ سے سہی نہ جائیگی اے دوست!
میں نے خونِ جگر کے نگینے چُن رکھے ہیں جنہیں راتوں کو سنبھالتی آئی ہوں۔
میں نے اُنہیں (اپنی بے قراری کی) نشانی کے طور سنبھال رکھا ہے تم آؤ تو تمہارے گریباں میں سجا دوں۔
میں تو اب برسرِ عام کہدونگی کہ کس کی آرزو نے میرے جسم کو گھلا دیا ہے۔
میں نہ تو طعن و تشنیع سے ہی ڈروں گی اور نہ کسی ایرے غیرے سے ہی خائف ہو جاونگی
مجھ مرجھائی ہوئی نرگس پر تمہارے شوقِ دید نے دوبارہ نکھار لایا ہے۔
میری آنکھوں کا نور تیرے پاؤں کے صدقے۔ آ ایک اور بار تجھے پیار تو کر لوں۔
مہجور کی تم سے یہی استدعا ہے کہ آدم بھر بیٹھ کے کچھ میری سُن۔ اپنی سُنا۔
میں تیرے لئے بہشت کے ساز بجاؤں گا اور نئے نئے ترانے گاؤں گا۔

ہیرٕ بونہٕ لاگِتھ جامہٕ وٕوزلیے   اَتھ کیا چھُہ معانے یِکمیوک نشان
ناحق خون مادرا یِتھ مِل ملیے
نورٕ وُزہ ملہ یے پُورہٕ ہاو پان

تو نے اوپر سے نیچے تک سرخ پہناوا کیوں زیب تن کیا ہے۔ کہیں تو خون ناحق کا رنگ مل کر اٹھکیلیاں تو نہیں کر رہی ؟

انہٕ گٹہِ یِم مُسافر وَتہِ ڈَلِہ یے   منز منز چھک تمن ژٕ وتھ ہاوان
چانہِ مشالہِ ہُند گاش چھُنہٕ مولیے
نورٕ وُزہ ملہ یے پُورہِ ہاوُ پان

ظلمتوں میں جو مسافر بھٹک جاتے ہیں انہیں تو راہ پر لگا دیتی ہے تمہاری مشعل کی روشنی خریدی نہیں جاتی۔ نور کے کوندے۔

تھزرٕ رَسے پیٹھ چی نارِ مشعلیے   گاش ہیتھ کُس چھُکھ ژھانڈان
ژھیپہٕ ژھایہِ ماچھک گنڈان ہاٹِلیے
نارہ وُزہ ملہ یے پُورہ ہاو پان

بلندیوں کی آتش پرکالہ۔ تو ہاتھ پر قندیل تھامے کس کی تلاش میں ہے کہیں تو اس بہانے دیپک ناچ تو نہیں ناچ رہی۔ دیوی !

زُلفکِ ہاٗلہٕ چھی تیچ ہاٗلہِ یے   کارِیتِ شوبان ماربیچان
سونہ ہارہِ مسنن وانکہِ دِل دِلیے
نورٕ وُزہ مِلہِ یے پُورہ ہاو پان

زلفِ جاناں کی طرح تیرے کاکل میں بھی خم پڑے ہوئے ہیں اور یہ لہراتے ہوئے سانپ انوکھی بہار دکھاتے ہیں تمہارے سنہری بال سلیقے سے گوندھے گئے ہیں۔ نور کی دیوی پوری طرح سامنے آ۔

بازِ ہیجرس کرئی ازلِہ یے   سیٔت بٲچ حصہٕ نس آۓ عجزان
شورہ پھُل گنزرکھ تَندِ دورہ پھلِہ یے
نورٕ وُزہ ملہ یے پُورہ ہاو پان

ہجور کی باری کب آئے گی۔ اس کے ہمدم اس کا رتبہ نہیں پہچانتے انہوں نے اس کے موتیوں کو خاشاک کی قدر دیدی۔ اے نور کی دیوی پورا درشن تو دے۔

حُسن دمہ دمہ رنگ بدلاوان   لال پرتھہ رنگہ تس پرزہ ناوان
پوش آسے نوٕ نوٕ تہٕ بُلبُل چھُہ پرون
بہ نو زرہ مَدنو دُور یہ چون

حُسن کے پیکر تو گھڑی گھڑی کے بعد بدلتے رہتے ہیں۔ مگر محبت کی نظریں اسے ہر حال میں تاڑ لیتی ہیں۔
پھول تو آئے دن شکل بدلاتے رہتے ہیں۔ مگر بلبل وہی ہے۔ میرے بالم میں تیری جدائی نہیں سہ سکتی۔

بہار

دل تمبہ لاوان جلوہ ہاوان آکھا بہارو
مشہ راومژہ کتھ یاد پاوان آکھا بہارو
بیہ نندرِ ہتین وزہ ناوان آکھ پرِ سک پاکھ
بیہ زندگی ہند راز باوان آکھا بہارو
بیہ مارِ مندن یاد یاوان چھک ژہ موکنیج چال
بیہ رُوشِس متین منہ ناوان آکھا بہارو
بیہ مودرِ متین زندگی ہند جامہ دلان آکھ
بیہ داد لدن سنبہ لاوان آکھا بہارو
بخشت ژہ آرن آبشارن دردہ سوزک ساز
افسانہ لولک ونہ ناوان آکھا بہارو
بہیار گاش گردِ کھیاوژ آس یمبرزل
مس کھاس تس کت باگہ راوان آکھا بہارو
وُنِ کینُ چھُہ چونی راج ژے کُن ٹل چھیہ تارن راج
قانون پنہ نی ماٗنہ راوان آکھا بہارو
ھسے بُنگہ گمتین آیہ زبان چانہ درشنہ سیت
ٹوٗرین تہ دلن پھولہ راوان آکھا بہارو
چھی رنگ پانس بہت وادہ بانہ چھک بے رنگ
رنگہ رنگہ چمن رنگہ ناوان آکھا بہارو
غارن شیدان مندرن سترزو تاپہ تو چون
شیخن تہ سادن مژہ راوان آکھا بہارو

تعمیر

ترجمہ:-
دل کو بھاتے اور جلوے بکھیرتے ہوئے بہار آگئی ہے۔
بیتی ہوئی باتیں پھر سے یاد آنے لگی ہیں۔
پچھلے سال کی مانند اب کے بھی نیند کے ماتوں کو بیدار کرتی آئی ہے۔
اور پھر سے زندگی کے راز افشا کرتی ہوئی بہار آگئی ہے۔
تم نازنینوں کو پھر خرام کے انداز سکھا رہی ہو۔
اور روٹھے ہوئے دلوں کو منا رہی ہو۔
تم پھر نیم جانوں کے تن پر زندگی کے لباس سجا رہی ہو۔
اور دُکھی دلوں کو پھر سے سنبھالا دے رہی ہو۔
تم نے ندیوں اور آبشاروں کو پھر سے زندگی کا نغمہ سنج بنا دیا ہے۔
اور پھر سے ان کی زبانی پریم نگر کے فسانے بیان کرنے لگے۔
نرگس تو پژمردہ ہو کر خاک آلودہ ہو گئی تھی۔
اُس کے لئے تو امرت کے خم لنڈھاتی ہوئی آئی۔
اب تو تمہارا ہی راج ہے اور گلشنوں میں تیرے ہی نام کا سکّہ رواں ہے۔
سارے جگت میں تمہارا ہی تمہارا قانون جاری ہے۔
بے زبان تمہاری آمد کی وجہ سے دولت نطق سے مالا مال ہو گئے۔
غنچوں اور دل کے شگوفوں کو چٹکاتی بہار آگئی۔
تمہارے ساتھ نکہت و نور کے طوفان ہیں۔ مگر خود کسی رنگ میں رنگی نہیں ہو۔
اور پھر بھی تو طرح طرح کے چمن زاروں کو طرح طرح کے رنگوں سے سجا رہی ہے
غاروں، مسجدوں اور مندروں میں بھی تمہاری تابانی کی شعاعیں پہنچ ہی گئیں
اور اب تو زاہد اور پارسا بھی دیوانگی کے نشے سے چور ہو رہے ہیں۔

نالۂ مہجور

اے صبا رفتارِ پیکِ خوش خرام ؎ اے امینِ لعلِ دُرِ ہائے کلام
اے بقائے مایہ صبر و قرار ؎ اے تحمّل بخشِ مرغِ دلفگار
اے امانت دارِ یارِ مے فروش ؎ اے خریدارِ دل گُم کردہ ہوش
اے شفائے دردِ جان و رنجِ تن ؎ اے توئی ہمرازِ من دمسازِ من
اے انیسِ خلوتِ دلدادہ گاں ؎ دستگیر و مونسِ افتادہ گاں
اے نگاہت مرہمِ زخمِ جگر ؎ در لبانت نوش دارو سر بسر
اے پیامت رخنہ سازِ عقل و ہوش ؎ عقلِ ظاہر بین و ہوشِ حق فروش
زندگی بخشِ سقیم جاں بلب ؎ وے علاجِ نالہ ہائے نیم شب
رہ نوردِ منزلِ جانانِ من ؎ اے فدائے گردِ راہت جانِ من
غم ربائے عاشقِ شوریدہ سر ؎ اے سبک رفتار از بادِ سحر
محرمِ کوے نگارِ دلنواز ؎ اے سبق آموزِ دیوانِ نیاز
آشنائے لذتِ دردِ فراق ؎ اے توئی غواصِ بحرِ اشتیاق
عندلیب و ہُدہُد و شہبازِ من ؎ طوطئ شکر زبان جادو شکن
ماہرِ اسرارِ شانِ سروری ؎ راز دانِ شوکتِ پیغمبری
صد ہزاراں گُل ز گلشن چیدۂ ؎ زیرِ جامہ باغ ہا پوشیدۂ
لنگر افگن شو کنارِ بحرِ عشق ؎ شور شے پیدا کُن اندر شہرِ عشق
یادِ گُل دہ بلبلِ دیوانہ را ؎ لذتِ سوزشِ دلِ پروانہ را
اہلِ کشمیر را قوتِ پرواز دہ ؎ طاقت از دست رفتہ باز دہ
اے خوشا روزیکہ آئی سوے من ؎ ہمچو بادِ نوبہار اندر چمن
سر کُنم گر داستانِ ہجرِ یار ؎ ختم نتواں گشت تا روزِ شمار
از وصالش ماندہ ام مہجور و دُور ؎ کے رسد جانم بداں دار السرور
گرچہ مہجورم ز مہجوری چہ غم ؎ بُلبلِ از بوستانِ شاہدم
عاشقاں را دین و ایماں یادِ دوست ؎ بہتر از ذکر و عبادت نامِ اوست

ہاں بیا اے طائرِ عرش آشیاں
دہ بمن پیغامِ یارِ دلستاں

گل ویرانہ

دوش سوے سیر صحرا شد خیالم راہبر ؎ مثل مجنون رہ نورد دشتِ گشتم بے خطر

درمیاں کوہ وصحرا بر سبیل آمد مرا ؎ رشکِ گلزارِ ارم یک بوستانے در نظر

ہر طرف رنگین بہار و سبزہ زار و جوئبار ؎ نغمہ خوان بر شاخ گلبن عندلیب خوش مقر

در چمن گلہائے گوناگون بصف آراستہ ؎ وز پئے انجام خدمت باغبان بستہ کمر

گر گلے پژمردہ گردد از تموز آفتاب ؎ باغباں او را کند سیراب از خونِ جگر

گرد آلودہ شود گر چہرۂ گل ناگہاں ؎ میکند سر شوئے او از آب دیدہ زود تر

الغرض از لطف و مہرش ہر گل خورد و کلان ؎ پر ز آب و تاب بر فرشِ گلستان جلوہ گر

از سموم حادثاتِ دہر و زباد خزان ؎ ایمن و بے باک و بے غم ماندہ ہر گل ہر شجر

چوں شدم فارغ ز سیرِ گلشنِ جنّت نما ؎ جانبِ ویرانہ رفتم شاد و خورّم بیشتر

تا بحدّے کز نظر غائب شد آن باغ ارم ؎ چون رسیدم دامنِ کہسار بے خوف و خطر

نے درخت و بلبلے نے خار در وے نے گلے ؎ نے دگر چیزے بغیر از سبزہ و خاک و حجر

خیرتم شد از وقوعِ ماجرائے طرفہ تر ؎ لیکن از خوشبو معطّر شد دماغم ناگہاں

در تگ و دو جستجو کردم یمین و ہم یسار ؎ یکطرف در گوشۂ دیدم گلے مثلِ قمر

چاک دامن خاک بر تن روے زرد و سرنگون ؎ چہرۂ نازک گرفتہ صورت و شکلِ دِگر

از شمیمِ عطر بارش خاکِ ویرانہ شدہ ؎ تازگی بخشِ روان مانند صحرائے تتر

در تحیر اوفتادہ پای رفتارم نماند   ایستادم پیش گل با آہِ سرد و چشمِ تر
گفتمش ای شاہدِ رعنائے گلزارِ ارم   وے زگلہائے جہاں از رنگ و بو والا گہر
اندریں وادی است باغے رشکِ فردوسِ بریں   ہر گل او ایمن و بے خوف و محفوظ از ضرر
صد ہزاراں گل درد بے وصف تمکیں یافتہ   با چنیں خوش رنگ و نکہت تو دریں حال بتر
چوں بگوشِ گل رسید ایں نالۂ ہمدرد خویش   پارہ پارہ گشت و بیروں آمدش لختِ جگر
از زبانِ حال با من پند داد و دُر فشاند   یا بحکمت مخزنِ اوراک را بکشاد در
گفت اے مہجور از نیرنگئے چرخِ کہن   نیستی آگاہ؟ ندانی؟ حیلۂ ایں حیلہ گر
خار و خس در صحنِ گلشن لالہ اندر کوہسار   سینۂ او داغ دار از کس مپرسی خم کمر
سگ درون قصرِ شاہی مست بر فرشِ حریر   شیرِ نر در غار کہنہ بر زمین افکندہ سر
شکوۂ جورِ فلک پامال مضمونِ قدیم   ترک کُن ـــ بیں سوی خود ای صاحبِ علم و ہنر
حضرتِ انساں کو لافِ انا الحق میزند   مے شمارد ذاتِ خود را از ملک پاکیزہ تر
لیک در تنظیمِ انساں ایں تماشا دیدہ ام   عاقلے محتاجِ لطفِ ابلہ شوریدہ سر
در تمیزِ خویش و بیگانہ دریں دیر و کہن   گُل شمارد خار را خر مہرہ پندارد گہر

چوں ندانی قدرِ جنسِ خویش اے بسیار گو
تو چہ دانی قدرِ گل روداستاں کُن مختصر

●

ماسٹر جی

پوشہ مُت پرواز فرماوُ وقتِ کار   پوش نو ہیُتھ یام وُوُن آیوُ بہار
پوشِ اُنمس ندر پیٹھ شعرس اندر   از کرن گُل پوشِ مہجورَن مزار
پوشہ مُوت مہجورَ گو داخل بہ حق   "ہائے کشمیرک سُخندان"! (کر شُمار)
تاریخِ وفات ۱۳۷۱ھ

میں کون ہوں؟

مخمس اُردو

گلزار کاشمیر کا سروِ خمیدہ ہوں — صحنِ چمن کا سبزۂ دامن کشیدہ ہوں
خاموش مثلِ غنچہ خاطر گزیدہ ہوں — نے بلبلِ چمن نہ گُلِ نو دمیدہ ہوں
میں موسمِ بہار میں شاخِ بریدہ ہوں

ہر روز رنج و سوز سے رہتا ہے دل فگار — ہر شب میں شمع کی طرح روتا ہوں زار زار
ہر آں میری جان ہے مصائب کے زیرِ بار — ہر شام مثلِ شام۔ میں ہوں تیرہ روزگار
ہر صبح مثلِ صبح گریباں دریدہ ہوں

آتے ہیں دُور دُور سے رندانِ خوش خرام — وہ مستِ بادہ اور میں رہتا ہوں تشنہ کام
اپنی کمی و غیر کی بیشی پہ صبح شام — گویا بشکل شیشہ ہوں خنداں بطرزِ جام
اس میکدے کے بیچ عبث آفریدہ ہوں

ناواقفِ حیات و ممات اور گرم و سرد — ناآشنائے فرقِ سفید و سیاہ و زرد
مجبور سن یہ نکتہ اقوالِ نیک مرد — میں کیا ہوں اور کون ہوں سودا بقول درد
جو کچھ بھی ہوں میں سو غرض آفت رسیدہ ہوں

علاقہ چھراٹ [۱]

مُلکِ کشمیرس اندر تھود شان کیا تھاوان چھراٹ — دُنیاہس اندر چھُ جنّت یاد اَسہٕ پاوان چھراٹ

خوش نِیُومُن آب وہوا مُردن چھُ بخشان زندگی — زندگی ہیند راز باوان نیندرِ وُزہ ناوان چھراٹ

خلق خوش مہمان نوازی خوش تمیزی خوش دِلی — رُت پکھُن انسانیت لُوکن چھُہ ہیچہٕ ناوان چھراٹ

یِم صِفت سارِی شُبان اَسس مگر اکھ عیب چھُس — علمہٕ کِس دربارس اندر ناو منده چھاوان چھراٹ

عِلمہٕ کِس باغس چھِ وقتس پیٹھ پھولان گُل بے شمار — اڈہ پھولہٕ نئی پوشہٕ ٹُوریں برہ کرہ ناوان چھراٹ

دُورِ جایہ از پوان استاد چھی ہاوان ژہ وَتھ — از کہ برونٹھ اوس دُورِ کِن یِژ کال وتھ ہاوان چھراٹ

یِم پھِقر کمر وَرأس تِم علمہٕ سیتِ کھٔت آسمان
غفلتچہٕ بجہٕ لیفہٕ تل پِنہٕ نِیُن بکھِن ساوان چھراٹ

(ناتمام)

۱ تحصیل پلوامہ کا وسطی علاقہ

گرلز سکول

آو صُبحک واو تو نشان خوش خبر ہیتھ بُلبُلن
عِلمہ کِس باغس بہار آو پوشہ ٹھتر ساری پھولن

پوشہ وارین پھیرِ سبزی نیرِ سورُوئی آمہ ناو
ہوشہ ڈُلمتِ سنبلن بیمار گامُت دِل بلن

درس گاہ علمکُ یہ گھرہ خوش پوُن باغاہ چھُ جان
کھتھ ین ییتہِ پوشہ ٹورین گاش ییہِ ہمبرزلن

ہیعہ پوشکِ پاٹھِ کنڈ لویہ درس باغ چھاون راتِ دوہ
گاٹہ جارِک سُرمہ لاگن شرمہ ہیُند پوڈر ملُن

واو صُبحک۔ مدرسک اُستاد دوہنہ وُئے کارِ گر
داوُ پھولہ ناوان گُلن۔ استاد پھولہ ناوان دِلن

سانہِ ملکُک کورِ مدرسہ زن پوستانک سکول
شوقہ سان وہنہ وان زن یمہ ورِگنہ منزآرہ بلن

آسمانس زُونہِ نکھہِ تل کرِزہ بلہ تراوان گاہ
مدرسس منز کورہ بولان مارِہ زن ہیٹھ رایلن

کرُ دُعا مہجورہ پتہ وتھ پھولہوُن روزِن یہ باغ
باغوان روزِن سلامت تازہ گی پوشن گُلن

ع ا ثریا

قطعاتِ تاریخِ وفات

کشمیر کے مشہور و معروف و مقبولِ عام مُغنی اور خود مہجور کے بہت محبوب موسیقار غلام محمد بٹ المعروف محمود شہری کی جوانمرگی پر:-

کأشُر کستوٗرُ محمود شہری — کاشرہ گیونکُ پُورہ اوستاد
ارماں اَسِہ تھوٗوُتھ تمُ تِرہ وہری — گُل دوپہر اوس تُلہ آس ناد
کأشِر سازن دون ٹھُہر ٹھہری — کأشِر پاٹھِ اَسِہ بوٗز تاریخ
زالٹھ مہجورُن محمود شہری — بس یہی سنہ تھاو ہجری یاد

۱۳۵۶ھ (۱۹۳۷ء)

●

انقلابی شاعر اور اپنے معاصر عبدالاحد آزاد کی جواں سالی اور بے وقت موت سے متاثر ہو کر:-

کاشرین ہندہ رِطلہ اد بُک باغ از برباد گو
باغ دُچھنے حسرتاہ ہینتھ باغ و دل شاد گو
سرفدا کور باغوانن دراواد سالِ وفات
بولہ دُن زن بُلبلا تراوِتھ چمن آزاد گو

۱۳۶۵
+۲
۱۳۶۷ھ (۱۹۴۸ء)

دیگر فارسی میں

آہ آزاد از جہاں روپوش شد — یا کہ از جامِ بقا مدہوش شد
گفت مہجور از پئے سالِ وفات — بُلبلِ شیریں بیاں خاموش شد

۱۹۴۸ء

تعمیر

علامہ اقبالؒ کی وفات حسرت آیات کی خبر سُن کر بے اختیار زبان سے نکلا اور اسی سے سالِ وفات بھی برآمد ہوا:-

آہ اقبال آفتابِ آسمانِ شاعری

۱۳۵۷ھ سنہ

●

ایک شعر

شاہ بادہ میر اوس بادکران قندہ ہارِچ زوٗن سہ
تس کونہ ژیتس آس پیوان ژندہ ہارِچ زوٗن سہ

نوٹ:- یعنی رسول میر شاہ آبادی اپنے شعروں میں "ماہ نخشب" (جس کو کہ کشمیری میں قندہ ہارِچ زوٗن کہا جاتا ہے) اکثر استعمال کرتا تھا۔ اُس کو موضع ژندہ ہار کی زوٗن (جو کہ حبہ خاتون کا اصلی نام تھا) یاد کیوں نہ آتی تھی؟

رام لال کھجوریہ
چیف کنزرویٹر آف فارسٹس

(ترقی کے منصوبے)

زمین کا کٹاؤ اور اس کے بچاؤ کے طریقے

سطح زمین جو اس قدر ناہموار معلوم ہوتی ہے۔ پانی کے بہاؤ سے اور ریگستان میں زور کی ہوا سے بھی بہت حد تک بدلتی رہتی ہے۔ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے۔ کہ بارش گرنے یا برف پگھلنے پر جب پانی بہتا ہے تو اپنے ساتھ باریک مٹی کی تہہ اور زمین میں پائے جانے والے کیمیائی اجزاء کو جو پانی میں جلدی حل ہو جاتے ہیں بہا کر لے جاتا ہے۔ اسی وجہ سے تو پانی کا رنگ بھی مٹیالا ہو جاتا ہے۔ جس جگہ زمین کی ڈھلوان زیادہ ہو وہاں لازماً پانی تیزی سے بہتا ہے۔ اور اپنے ہمراہ نہ صرف زیادہ مقدار میں مٹی کو گھسیٹتا ہے بلکہ ریت، کنکر اور پتھر کے چھوٹے موٹے ٹکڑوں کو بھی بہا لے جاتا ہے۔ ناہموار کھیتوں میں جن کی اوپری سطح ہل چلانے کی وجہ سے نرم اور ڈھیلی پڑ گئی ہوتی ہے مٹی اور بھی زیادہ مقدار میں بہہ جاتی ہے۔ اُن کی ڈھلوانوں پر تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر چھوٹی چھوٹی دراڑیں (یعنی نالیاں) سی بن جاتی ہیں۔ انہی نالیوں میں سے گدلے یعنی مٹی آمیز پانی سے نالے اور بعد میں دریا بنتے ہیں۔ بڑی نالیوں اور نالوں میں بارش کے دوران بہت زیادہ مٹی۔ کھاد۔ ریت۔ کنکر اور پتھر بہتے ہیں۔ جو سیلاب کی صورت اختیار کر کے نشیبی علاقوں میں بہت زیادہ نقصان کا موجب بن جاتے ہیں۔

اس کے برعکس عقلمند انسان سمجھ سکتے ہیں کہ جن علاقوں میں زمین ہموار ہے۔ جیسے کہ میدانی علاقے یا ایسی ڈھلوان زمین جو جھاڑ پول اور گھاس پھوس سے ڈھکی ہوئی ہو جیسے کہ جنگلات یا ایسی زیر کاشت زمین جس کی مناسب طریق Teer raceing یعنی بٹ بندی کی گئی ہو بالعموم بارش کے دوران محفوظ رہتی ہے کیوں کہ ایسی زمینوں تعمیر میں پانی زیادہ تر جذب ہو جاتا ہے۔ اور بہت کم پانی زمین کی سطح پر بہنے لگتا ہے۔ کیوں کہ جڑوں اور پتوں کی بدولت یا بٹ بندی کی وجہ سے پانی آہستہ آہستہ بہتا ہے اور تیز بہاؤ کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ زمین کی زرخیزی کا مادہ بہنے نہیں پاتا۔ اور اس کا مکمل بچاؤ رہتا ہے۔ ندی نالوں تک بھی پانی دھیرے دھیرے پہنچتا ہے۔ اور سیلاب شدت نہیں پکڑتا جس سے میدانی علاقوں میں نقصان نہیں ہونے پاتا۔ اس کے علاوہ زمین اچھی طرح بچ جانے کی وجہ سے زیادہ عرصہ تک نمدار رہتی ہے۔ جو گھاس پھوس اور فصلوں کے لئے نہایت مفید صورت ہوتی ہے۔ ندی نالوں میں پانی کا ذخیرہ مناسب رہتا ہے۔ اور سال بھر بہتا رہتا ہے۔ اس طرح ندی نالے خشک بھی نہیں ہونے پاتے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جہاں زمین کے کٹاؤ کو روکا نہ جائے تو حالات دن بدن خراب ہو جاتے ہیں۔ جنگلوں یا فصلوں کی پیداوار روز بروز کمزور جاتی ہے۔ اور ندی نالے زیادہ تر خشک رہتے ہیں۔ بارش کے دوران میں سیلاب شدت اختیار کرتے ہیں۔ اور زراعت اور مال مویشی کے نقصان کا باعث بنتے ہیں۔ پانی کے چشمے خشک ہو جاتے ہیں۔ آب ہوا شدید صورت اختیار کرتی ہے۔ یعنی گرمیوں میں بہت گرم اور سردیوں میں بہت سرد ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ مدتوں کے بعد زمین ریگستان کی صورت اختیار کرتی ہے۔ جہاں انسان کی رہائش مشکل بن جاتی ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ دنیا کے ریگستان فطرت سے زیادہ انسان کے اپنے پیدا کردہ ہیں۔ مہذب انسان کو آئندہ کے لئے احتیاط کرنی

چاہیئے۔

عوام اس بات سے واقف نہیں کہ زمین کی سب سے اوپر کی سطح جس کو سائل (Soil) کہتے ہیں ایک ایسی اہم چیز ہے کہ فصل یا ہر قسم کی نباتاتی پیداوار کا دار و مدار اسی پر ہے۔ اس کی چند انچ موٹائی کو پیداوار کے لئے موافق بننے میں صدیاں لگتی ہیں۔ مگر انسان کی لاپروائی اور عاقبت ناشناسی سے زمین کی طاقت پیداوار زائل ہو جاتی ہے۔ اور ہر قسم کے فصل کی پیداوار کمزور پڑ جاتی ہے۔ سائنسدانوں کا تجربہ ہے کہ زمین کے کٹاؤ ایک ایکڑ زمین میں سے سالانہ کئی ہزار من مٹی اور کھاد ضائع ہو جاتی ہے۔

غیر مہذب یا کم ترقی یافتہ ملکوں میں زمین کا کٹاؤ صدیوں سے جاری ہے۔ ان کی اقتصادی حالت روز بروز خراب ہو رہی ہے۔ اس کے برعکس ترقی یافتہ ممالک میں زمین کے کٹاؤ کو قطعاً روک لیا گیا ہے۔ چنانچہ وہاں زمین سے پیداوار پورے طور پر حاصل کی جا رہی ہے۔ ان ملکوں میں سوچ سمجھ کر زمینوں کو اناج اگانے یا گھاس چارہ حاصل کرنے کے لئے الگ الگ مخصوص کیا جاتا ہے۔ مثلاً جو زمین ہموار یا ۵ درجہ تک ڈھلوان ہو وہاں کھیتی باڑی کرنے کی اجازت ہے۔ ۵ درجہ سے ۲۵ درجہ ڈھلوان والی زمین میں اگر کھیتی باڑی مطلوب ہو۔ تو اس پر لازماً Terracing یعنی بٹ بندی کی جاتی ہے۔ تاکہ زمین کا کٹاؤ ہو جانے یا کھاد ضائع ہونے کا امکان نہ رہے۔ ۲۵ درجہ سے زیادہ ڈھلوان زمین پر کاشت کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اور جو زمین قابل زراعت نہ ہو اس میں سے موزون رقبوں میں گھاس چارہ پیدا کیا جاتا ہے اور باقی ماندہ پر جنگل اگائے جاتے ہیں۔ اس طرح ذرہ بھر زمین بیکار رہنے نہیں دی جاتی اور نہ ہی ملک کی زمین کو کسی طرح سے کمزور ہونے دیا جاتا۔

سائنسدانوں نے تجربہ سے یہ بھی ثابت کر دیا ہے۔ کہ مسلسل چرائی سے زمین کی گھاس یا درخت، پیدا کرنے کی قوت ضائع ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس جس زمین میں چرائی بند کرائی جائے۔ وہاں زمین کی حالت سدھر جاتی ہے۔ اور گھاس چارہ اس افراط سے پیدا ہوتا ہے کہ مویشیوں کے لئے پہلے سے کئی گنا زیادہ چارہ مہیا ہو جاتا ہے بعض حالات میں کچھ زمین مال مویشی کے چرنے کے لئے کھلی رہتی ہے اور باقی بند مناسب یہ ہے کہ زمین کے مختلف قطعات کو بدل بدل کر زمین کی زرخیزی کو قائم رکھا جائے۔

ہمارے اپنے ملک میں بھی کوئی پچاس سال سے زمین کو کٹاؤ سے بچانے کی تدابیر کی گئی ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر میں تقریباً ۱۵-۲۰ سال سے اس طرف قدم اٹھایا گیا ہے۔ خاص توجہ پہلے پانچ سالہ منصوبہ کے تحت دی گئی ہے۔ جبکہ تقریباً چالیس ہزار ایکڑ رقبہ کو ہاتھ میں لایا گیا تھا۔ اور تقریباً ۱۰ لاکھ روپیہ خرچ کیا گیا تھا۔ اور اب دوسرے پنجسالہ کے تحت بہت بڑے پیمانے پر کام شروع کیا جا رہا ہے۔ اس کام کے لئے تقریباً ۳۶ لاکھ روپیہ مخصوص کیا گیا ہے۔ اور بہت زیادہ نئے رقبوں کو زیر کار لایا گیا ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل علاقوں کو پہلے زیر کار لایا جا رہا ہے۔

(۱) صوبہ جموں میں علاقہ کنڈی کے تمام رقبوں کو جو دریائے راوی سے دریائے چناب اور دریائے مناور توی تک واقع ہیں۔ اس میں سے تقریباً ۲۵ فیصدی رقبہ کو کٹاؤ سے بچانے کی صورت پیدا کی گئی ہے۔ تاکہ اس علاقے کے ندی نالوں سے جموں پٹھانکوٹ کی سڑک راوی و اوجھ کی نہر اور نیچے کی زرخیز زراعتی زمینوں کو نقصان سے بچایا جا سکے، اور وہاں کے کنوؤں اور نالوں میں پانی بآسانی اور سال بھر دستیاب ہو سکے۔ گذشتہ دس پندرہ سال کے تجربے سے پایا گیا ہے۔ کہ جہاں جہاں جنگلوں کی روک تھام کی گئی ہے۔ اور بکری کے چرنے پر پابندی لگائی گئی۔ نتیجے خوشگوار اور کامیاب رہے ہیں۔ گھاس چارہ بکثرت مہیا ہو رہا ہے۔ اور کنوؤں، نالوں میں پانی بڑھ گیا ہے۔

(۲) جموں سے سری نگر شاہراہ کی حفاظت کے لئے بھی ادھم پور سے بانہال تک سڑک کے دونوں طرف جتنے بھی Bank کے Slider یا پسیاں گرتی ہیں۔ وہاں پودے لگا لگا کر اور کہیں کہیں پتھر کی دیواروں سے گرتی ہوئی پہاڑیوں کی روک تھام

کی گئی ہے۔ تاکہ آمد و رفت کے لئے سڑک محفوظ رہے۔

(۳) کشمیر کی وادی میں چرار شریف کے مقدس مقام کے ارد گرد کی زمین میں کٹاؤ کی حالت نہایت تشویشناک تھی۔ گذشتہ بارہ پندرہ سال سے یہاں لاکھوں پودے لگا کر سینکڑوں ایکڑ زمین کو بڑھتے ہوئے کٹاؤ سے بچا لیا گیا ہے۔ اور گہرے نالوں میں مصنوعی بند ڈال کر خطرے کو بہت حد تک کم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سری ٹنگ انت ناگ۔ مٹن۔ عشن مقام۔ شنکر آچاریہ پہاڑی۔ قلعہ ہاری پربت۔ ملہار۔ گاندربل۔ بانڈی پورہ۔ باباشکردین کی ڈھیری۔ ڈلب۔ وارپورہ۔ لولاب ہونڈ تحصیل بارہ مولہ میں بھی ننگی پہاڑیوں پر درخت اُگائے جا رہے ہیں۔ اور دریائے پُہرو کی وادی میں زمین کے کٹاؤ کو روکنے کے لئے خاص اقدام زیر عمل ہیں۔ نالہ رمبی آرہ شوپیان اور نالہ برنگی میں بھی ایسی تدابیر زیر غور ہیں۔ تاکہ دریائے جہلم میں آئے دن جو سیلاب آتے ہیں اور شہر سرینگر کے لئے خطرناک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی روک تھام ہو سکے۔

(۴) ضلع لداخ میں کرگل کے نزدیک دریائے سورو سے اور لہ کے نزدیک دریائے سندھ سے زراعتی زمینوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس کی روک تھام کے لئے باضابطہ تار اور پتھر کے کریٹ یعنی بندھ باندھے گئے ہیں۔

(۵) اس کے علاوہ تحصیل بسوہلی، رام نگر، ریاسی۔ راجوری اور ضلع ڈوڈہ میں جگہ جگہ زمین کے کٹاؤ کی روک تھام کی تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔ غرضیکہ تمام ریاست بھر میں یہ کام زوروں پر ہے۔ اور جہاں نمایاں کامیابی ہو رہی ہے۔ لوگوں میں خود بھی اس طرف شوق پیدا ہوتا جاتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ زمیندار لوگ خاص کر کشمیر ویلی اور ڈوڈہ ضلع کے یہ محسوس کریں کہ زیادہ ڈھلوان پر جو کاشت کی جاتی ہے وُہ قومی خودکشی کے برابر ہے۔ بہت زیادہ ڈھلوان پر یعنی ۲۵ درجہ سے زائد پر کاشتکاری ہونی ہی نہیں چاہیئے۔ یہاں موزون قسم کے درخت خواہ پھلدار ہوں یا دوسری قسم کے اُگانے چاہئیں، یا گھاس چارہ پیدا کیا جانا چاہیئے اور متوسط درجہ کی ڈھلوان پر باقاعدہ بٹ بندی ہونی ضروری ہے۔ اس غرض سے لوگوں کو ہر تحصیل میں ایک ایک ۔۔۔ بھی قائم کیا گیا ہے۔ تاکہ اس کی نقل کر سکیں۔ اگر لوگ پھر بھی اس طرف توجہ نہ دیں تو قانونی طور پر یعنی ایکٹ P.A.L. کے تحت کاروائی کر کے روک تھام کرنی لازمی ہوگی۔ اُمید ہے لوگ اپنے اور ملک کے مفاد کو مدنظر رکھکر پورا تعاون کریں گے۔ تاکہ بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ ساتھ زمین کی پیداوار کی تدابیر کو بھی عملی جامہ پہنایا جا سکے، اور ہمارا ملک ترقی کی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہ رہے۔

(بشکریہ ریڈیو کشمیر سری نگر)

آہ مہجور

(مرثیہ کے چند شعر)

مرزا عارف

روشہ کوٗت ژول پوٗشہِ موٗت دلدار میون — ہوشہِ ڈولُن پوشہِ ہوٗت گلزار میون

مرِکھا موتو صبر کرِ ہک اگر — ژھلیہ ژھل ہیٔت واتہٕ ہی دلدار میون

ژھینہ وانس لولہ کھاسین مَس بھرِت — بستر لب مہجورِ خوش گفتار میون

عارفو مہجورُ کوٗت مادُر گو — زالہِ موتک پردہ دردک نار میون

انتخابات — ایک نظر میں

(تعمیر کے نمائندہ خصوصی کے قلم سے)

نئے آئین کے تحت مجلس قانون ساز کیلئے گذشتہ ماہ مارچ میں جو انتخابات عمل میں لائے گئے، ان میں نیشنل کانفرنس کو ٹھوس اکثریت حاصل ہو گئی ہے، ابھی تک ضلع لداخ کی دو نشستوں اور ضلع ڈوڈہ کی پانچ نشستوں کے لئے انتخابات عمل میں نہیں لائے گئے ہیں۔ بہت جلد ان اضلاع میں بھی انتخابات عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ اس وقت تک پارٹی پوزیشن یہ ہے:۔

نیشنل کانفرنس — ۶۱
پرجا پریشد — ۵
ہریجن منڈل — ۱
آزاد اُمیدوار — ۱

نئے منتخب شدہ ممبران کے اسمائے گرامی اور حلقہ ہائے انتخاب ذیل میں دئے جاتے ہیں۔

نام اُمیدوار	حلقہ انتخاب صوبہ کشمیر	جماعت
جناب بخشی غلام محمد	صفاکدل	نیشنل کانفرنس
خواجہ غلام محمد صادق	ٹنکی پورہ	〃 〃
پنڈت شیام لال صراف	امیرا کدل	〃 〃
شری ڈی، پی، در	حبہ کدل	〃 〃
میر واعظ غلام نبی ہمدانی	رعناواری	〃 〃
پیر یحییٰ شاہ	حضرت بل	〃 〃
عبدالرحمان بٹ	خانیار	آزاد اُمیدوار
بخشی عبدالرشید صاحب	چرار شریف	نیشنل کانفرنس
میر غلام محمد میر کسیجن	دریہ گام	〃 〃
عبدالرحمان راحت	خانصاحب	〃 〃
سید علی شاہ صفوی	بڈگام	نیشنل کانفرنس
سید عبدالقدوس آزاد	بیروہ	〃 〃
میاں نظام الدین	کنگن	〃 〃
صوفی غلام احمد	گاندربل	〃 〃
سید میر قاسم صاحب	ڈورو شاہ آباد	〃 〃
میر سید حسین	برنگ نوبگ	〃 〃
شری منوہر ناتھ کول	کوٹھار	〃 〃
مسٹر شمس الدین	اننت ناگ	〃 〃
مسٹر نورالدین ڈار	کھاور پارہ	〃 〃
مسٹر غلام احمد میر سلر	دچھن پارہ	〃 〃
مسٹر غلام محمد بٹ	کیموہ	〃 〃
مسٹر عبدالکبیر وانی	کولگام	〃 〃
مسٹر عبدالعزیز زرگر	ڈاڈہ سر	〃 〃
مسٹر غلام حسن خان	نارہ واو	〃 〃
مسٹر عبدالمجید بانڈے	شوپیاں	〃 〃
مسٹر عبدالغنی ترالی	ترال	〃 〃
میر غلام محمد راجپوری	راجپورہ	〃 〃
ماسٹر ثناءاللہ	پلوامہ	〃 〃
پیرزادہ غلام جیلانی	پانپور	〃 〃
مسٹر غلام نبی سوگامی	لولاب	〃 〃
خواجہ غلام قادر مصالہ	ہندوارہ	〃 〃
مسٹر محمد سلطان تانترے	درگہ مولہ	〃 〃

مسٹر غلام محمد وانی	رامہال	نیشنل کانفرنس
مسٹر محمد یونس	کرناہ	〃 〃
ملک عبدالغنی	سوپور	〃 〃
مسٹر غلام رسول کار	حمل	〃 〃
مسٹر عبدالخالق بٹ	سنی وارہ	〃 〃
مسٹر عبدالکبیر خان جیل بابا	بانڈی پورہ	〃 〃
سردار ہربنس سنگھ آزاد	بارہمولہ	〃 〃
مسٹر غلام محمد جالب	پٹن	〃 〃
مسٹر غلام محمد کاہاما	ماگام	〃 〃
مسٹر محمد اکبر	ٹنگمرگ	〃 〃
راجہ محمد افضل خان	اوڑی	〃 〃

صوبہ جموں کے انتخابات

پنڈت گردھاری لال ڈوگرہ	ہیرانگر	نیشنل کانفرنس
میجر پیارا سنگھ	کٹھوعہ	〃 〃
مسٹر مہیش چند	بسوہلی	پرجا پریشد
مسٹر رام چند کھجوریہ	بلاور	نیشنل کانفرنس
کنور ساگر سنگھ	سانبہ	〃 〃
مسٹر رام پیارا صراف	بشناہ سانبہ جنرل	〃 〃
مہاشہ ناہر سنگھ	بشناہ سانبہ ریزرو	〃 〃
سردار کلبیر سنگھ	رنبیر سنگھ پورہ جنرل	〃 〃
بھگت چھجو رام	رنبیر سنگھ پورہ ریزرو	〃 〃
مسٹر تارا چند	جموں تحصیل جنرل	پرجا پریشد
مسٹر ملکھی رام	جموں تحصیل ریزرو	ہریجن منڈل
مسٹر سہدیو سنگھ	اکھنور چھب جنرل	پرجا پریشد
مسٹر ست دیو	اکھنور چھب ریزرو	〃 〃
مسٹر ہیمراج جھنڈیال	رام نگر	نیشنل کانفرنس
پنڈت امرناتھ ایڈوکیٹ	اودھمپور	〃 〃
پنڈت موتی رام بیگڑہ	لانڈر ٹیکری	〃 〃

مسٹر رشی کیش	ریاسی	نیشنل کانفرنس
مسٹر محمد ایوب خان	ارناس	〃 〃
ماسٹر غلام احمد	حویلی پونچھ	〃 〃
پیر جماعت علی شاہ	مینڈھر پونچھ	〃 〃
مسٹر عبدالعزیز شال	راجوری	〃 〃
مسٹر محمد اقبال	درہال	〃 〃
شری کرشن دیو سیٹھی	نوشہرہ	〃 〃
رام چند مہاجن	جموں شہر جنوبی	〃 〃
پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ	جموں شہر شمالی	پرجا پریشد

واضح رہے کہ ضلع لداخ کی دو نشستوں کا ابھی انتخاب ہونے والا ہے ضلع ڈوڈہ کی پانچ نشستوں کے لئے نیشنل کانفرنس نے اپنے امیدواروں کے ناموں کا اعلان کیا ہے۔ مسٹر اسداللہ میر۔ رام بن انتخابی حلقہ کے لئے مسٹر عبدالغنی گونی بھلیس بھیجوا۔ میر بادشاہ کشتواڑ۔ کوتوال چونی لال بھدرواہ اور مسٹر غلام احمد دیو ڈوڈہ انتخابی حلقہ کے لئے نامزد کئے گئے ہیں۔

جتوں توں

(صفحہ ۵۹ سے آگے)

رہا تھا۔ گوری وحشی سی ہو گئی تھی۔ اور جیسے یکایک کانگڑی کے خول کی دم توڑتی ہوئی آگ لپک کر گوری کی ساڑی میں چھپ گئی، اور پھر اس کے بالوں میں جھٹ سے آ چھلانگی ..... اور یہ دیکھ کر کہ گھاٹ پر بچوں نے شور مچایا۔ لیکن جب تک لوگ گوری کو بچانے کے لئے گھاٹ کی پتھریلی سطح پر پہنچے، گوری نے آگ کا ناچ بند کر دیا تھا، اُس کے قدم ٹوٹ چکے تھے، اور اس کے جواں گداز بدن سے کانگڑی کے ادھ جلے خول کی طرح دھواں اُٹھ رہا تھا۔

شوراتری کے بعد تِلا اشٹمی کے دن گوری پُشکر کے سنگ کیلاش پربت کی طرف چل رہی تھی۔ ہمالیہ کے باسیوں نے اُس دن شنکھ بجائے تھے، دیپ مالا رچائی تھی!

ملک غلام مصطفےٰ
ڈائرکٹر فشریز

مچھلی پالنے کی صنعت

مچھلیوں کی تجارت سے یہاں ایک طرف لاکھوں باشندے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ وہاں دوسری طرف مچھلیوں کی پیداوار میں اضافہ کرنے سے غذائی قلت بہت حد تک دُور ہوسکتی ہے۔ علاوہ ازیں مچھلیوں کی غذائی اہمیت طبی اور ڈاکٹری اصولوں کے تحت مسلّمہ طور پر تسلیم کی گئی ہے۔ کیونکہ تمام غذائیات میں مچھلی بطور خوراک انسان کو تندرست طاقتور اور صحت یاب رکھنے کے لئے ضروری سمجھی گئی ہے کشمیر جیسے چاول کھانے والے علاقوں میں خوراک کے ساتھ مچھلی کا استعمال اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے استعمال سے چاولوں کی خوراک ایک مکمل اور متوازن غذا بن جاتی ہے جس کے استعمال سے انسان اپنے آپ کو کئی ایک بیماریوں سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ دُور دُور سے سیاح مچھلی کے شکار کے لئے آتے رہتے ہیں جو اس غرض کے لئے زرِ کثیر خرچ کرکے یہاں کی تجارت اور اقتصادیات کو ترقی دیتے ہیں۔ ان وجوہات کی بناء پر حکومت نے مچھلیوں کی حفاظت اور پرورش کے لئے ہر ممکن ذریعہ سے پانچ سالہ منصوبہ کے تحت مچھلیوں کی پیداوار میں اضافہ کرنے اور ماہی گاہوں کی حالت بہتر بنانے کے لئے ایک لائحہ عمل منظور کیا ہے جس پر سالِ رواں کے وسط سے عمل شروع کردیا گیا ہے۔

ٹروٹ مچھلی کی پیداوار بڑھانے کے لئے اچھہ بل، ہارون اور اہرہ بل ہیچریوں کو وسعت دی جارہی ہے۔ پرانے حوض ہا کو موجودہ طریقے پر تشکیل دینے کے علاوہ ان مقامات پر بڑی ٹروٹ کے لئے چھ اور چھوٹی ٹروٹ کے لئے ستر حوض ہا تعمیر کردئے گئے ہیں۔ گذشتہ دو سال میں ٹروٹ کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے بعد امسال جولائی کے مہینے سے ٹروٹ مچھلی کی فروخت براہ راست ہیچریوں سے بغیر پرمٹ شروع کردی گئی ہے۔ اس سے قبل بہت کم اور مخصوص اشخاص کو قلیل مقدار میں یہ مچھلی مہیا ہوتی تھی۔ گذشتہ ستمبر سے قیمت فروخت میں براؤن ٹرنٹ کے لئے ۳۳ فیصدی اور Rainbow ٹرنٹ کے لئے ۴ فیصدی کمی کر دی گئی ہے۔ سیاحوں کی سہولت کے پیش نظر ایک نئی ہیچری پہلگام جانیوالی سڑک پر بمقام ٹرہ کنڈ قائم کردی گئی ہے۔ اور مزید ایک ہیچری پہلگام خاص میں زیر تعمیر ہے ان ہر دو مقامات پر آئندہ اپریل کے ہر مہینے سے ٹروٹ فروخت کردی جائے گی۔ اچھہ بل اور ہارون کے ہیچریوں میں میلا پانی آنے کی وجہ سے بیضہ ہائے ٹراؤٹ اور ان سے پیدا شدہ بچوں کو نقصان سے بچانے کے لئے مقطر پانی سیمنٹ بکسوں کے ذریعے بہم پہنچانے کا خاصہ انتظام کیا جارہا ہے۔ تاکہ ہیچریوں کی پیداوار سے بہتر نتائج پیدا ہوسکیں۔ ان تمام کوششوں کی بدولت ہیچریوں سے دس ہزار پونڈ سے زائد مچھلی فروخت کی جاسکیگی۔ غیر آباد ٹروٹ نالوں کو از سر نو آباد کرکے شکار کے قابل بنایا جارہا ہے۔ صوبہ جموں کے سرد علاقہ جات یعنی لبسوہلی کا بھنی علاقہ، بھدرواہ، کشتواڑ میں بھی ٹراوٹ داخل کرکے سیاحوں کی تفریح کے لئے ٹراؤٹ شکار کی سہولت مہیا کی جارہی ہے۔ صاحبانِ شکار ماہی کی رہائش کے لئے ایک آرام گاہ علاقہ برنگی میں امسال تیار ہورہی ہے۔ اسی طرح آئندہ سال ایک آرام گاہ علاقہ لدر اور ایک آرام گاہ علاقہ سندھ میں تعمیر کی جائیگی۔ تاکہ ان سہولتوں کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ سیاح کشمیر میں بغرض شکار ماہی آسکیں۔

ٹروٹ مچھلی کو فروغ دینے کے علاوہ عام لوگوں کے لئے نئے اقسام کی مچھلیاں نیلگری سے لائی جارہی ہیں منصوبہ کے تحت ہر سال Mirror Carp کے تین چار ہزار بچے بانپور جھیل - اہن سر، منی بوگ، سوپور تالاب ترکام سر، ہوکرسر وغیرہ مخصوص تالابات آب میں پرورش کے لئے ڈالے جائینگے ان جھیلوں میں مچھلیوں کی افزائشِ نسل کے کافی مواقع موجود ہیں۔ اور دیگر جھیلوں کے مقابلے میں ماہی گیری سے آزاد ہیں۔ اس غرض کے لئے ایک نرسری گوتر پورہ ایک آنچار اور ایک اچھہ بل میں تعمیر کی جارہی ہے۔

صوبہ جموں کے گرم آب و ہوا کے علاقہ جات یعنی رنبیر سنگھ پورہ، کٹھوعہ

تعمیر

اور جموں میں بڑی کارپ کے اقسام خصوصاً رہو، کتلا اور سرگل مچھلی وہاں کے تالابوں میں پیدا کی جائے گی۔ ان اقسام کی مچھلی کا بیج دہلی، بنگال یا بہار سے لایا جائے گا۔ تجربہ کے طور پر واضح ہو گیا ہے کہ جموں کے تالاب تلو جیسے تالابوں میں کتلا مچھلی پالنے سے اس قسم کی مچھلی اچھی طرح نشو و نما پا سکتی ہے۔ مچھلی ڈالنے سے پہلے اس تالاب کی مرمت کر کے اس کو قابل استعمال بنایا گیا تھا۔ جموں اور رنبیر سنگھ پورہ کے دوسرے تالابوں کو امسال اور آئندہ سال مرمت کر کے ہر ممکن طریقے سے مچھلی پیدا کرنے کے قابل بنایا جائیگا۔ اس سکیم کے تحت صوبہ جموں کے مخصوص مقامات پر کارپ مچھلی عوام کو تین چار سال کے اندر سستے داموں فروخت ہو گی۔ اسی طرح صوبہ جموں کے سرد پہاڑی علاقوں خصوصاً کشتواڑ، بھدرواہ، رام نگر اور بسوہلی میں مرر کارپ پیدا کرنے کی تجاویز پر عمل کیا جائے گا۔

ریاست میں مچھلی کی پیداوار کا سب سے بڑا مرکز جھیل ولر ہے۔ جہاں سیزن کے دوران روزانہ ڈیڑھ سے دو سو من تک مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں اس مقدار کا بیشتر حصہ سرینگر لایا جاتا ہے۔ کیونکہ یہی اس کی کھپت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ اگرچہ سردیوں کے دنوں میں مچھلیاں تازہ حالت میں تیس چالیس میل دور مقامات سے سرینگر بخوبی پہنچ سکتی ہیں۔ مگر گرمیوں کے ایام میں یہ چند گھنٹوں کے اندر اندر سڑ کر ضائع ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ اس کے لانے میں بارہ گھنٹے سے زیادہ وقت عام چپہ والی کشتی کے پہنچانے میں صرف ہوتا ہے۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لئے محکمہ ہذا نے ایک گاڑی اور ایک انجن والی کشتی مہیا کرنے کا انتظام مکمل کر لیا ہے تاکہ مچھلیوں کی زیادہ سے زیادہ مقدار سرینگر اور دیگر اہم کھپت والے مرکزوں پر آسانی سے کم سے کم وقت میں پہنچائی جا سکے۔

ہر ملک میں مچھلیوں کی صنعت کا دار و مدار ماہی گیروں کی سماجی اور اقتصادی حالت پر مبنی ہوتا ہے۔ کشمیر میں دیگر ریاستوں کی طرح ماہی گیروں کی حالت نہایت ابتر ہے۔ وہ حد درجے کے غریب، لاچار اور ان پڑھ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ سالہا سال کی مفلسی اور قرضداری کی وجہ سے وہ اپنی زندگی کا معیار بلند کرنے سے قاصر رہے۔ اُن کی کمائی کا بیشتر حصہ استحصالی عناصر کے فائدے کے لئے وقف تھا۔ مگر موجودہ حکومت نے ان کو استحصالی عناصر سے نجات دلانے ان کا معیار زندگی بلند کرنے اور اُن کی سماجی اور اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لئے ان کو انجمن امداد باہمی کے ذریعہ منظم کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں تجربہ کے طور پر جھیل ولر کے مشہور گھاٹ وٹلب پر ایک سو ماہی گیروں کی ایک انجمن امداد باہمی قائم کر دی گئی ہے۔ جس کو آئندہ پانچ سال میں مناسب وسعت دی جائیگی تاکہ تمام علاقہ کے ماہی گیر اس تحریک سے مستفید ہو سکیں۔ جھیل ڈل کے ماہی گیروں کو طبی امداد بہم پہنچانے اور ان کے بچوں کو تعلیم دلانے کے لئے متعلقہ محکمہ جات نے محکمہ ہذا کی توجہ دلانے پر چند ایک اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ مخصوص مقامات پر ماہی گیروں کو بہترین طریقوں کے متعلق باضابطہ ٹریننگ دی جائے گی۔ اس طرح سے وہ زیادہ سے زیادہ مقدار میں مچھلیاں پکڑ سکیں گے۔ مزید برآں ان کو مچھلیاں زیادہ دیر تک تازہ رکھنے اور اُن کو حفظان صحت کے اصولوں کے تحت بہترین طریقوں سے مچھلیاں خشک کرنے کی ترکیبوں کے متعلق بھی آگاہ کیا جائے گا۔ تاکہ وہ اپنی اس پیداوار کو زیادہ دیر تک اچھی حالت میں رکھکر زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکیں۔ اس کے علاوہ اُن کو سستے داموں پر اوزار ماہی گیری مہیا کرنے کا سوال بھی زیر غور ہے۔ غرضیکہ ریاستی حکومت نے ماہی گیروں کی حالت ہر لحاظ سے بہتر بنانے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔

مندرجہ بالا امور کے علاوہ طلبا کی تفریح کے لئے صوبہ جموں میں مچھلیوں کا ایک فارم اور صوبہ کشمیر میں ایک فارم قائم کر دیا جائے گا۔ تاکہ طلبا ماہی گیری کے مختلف طریقوں سے مستفید ہو سکیں۔ اسی طرح مقامی لوگوں اور سیاحوں کی تفریح کے لئے زندہ مچھلیوں کا ایک شیشہ گھر تعمیر کیا جائے گا، جہاں پر مختلف قسم کی مچھلیاں زندہ حالت میں رکھی جائیں گی۔

مہجور کا یوم وفات

اس سال بھی ۹ اپریل کو ریاست کے علمی اور ادبی حلقوں میں حضرت مہجور کا یوم وفات منایا گیا۔ ریڈیو کشمیر سری نگر سے یوم مہجور پر ایک خاص طرحی کشمیری مشاعرہ نشر ہوا جس میں کشمیر کے شاعروں نے حصہ لیا۔ ان میں دینا ناتھ نادم۔ امین کامل۔ مظفر عازم۔ غلام نبی خیال۔ چمن لال چمن۔ فاضل کشمیری۔ خضر سغربی۔ بیکش کشمیری۔ میر غلام رسول نازکی۔ برق کشمیری اور غلام نبی فراق قابل ذکر ہیں۔ نوجوان کلب ملارٹہ میں بھی یوم مہجور منایا گیا۔

سیاسی مبصر کے قلم سے

ورق ورق

انتخابات ۔ مسٹر بیون کا دورہ ۔ مقبوضہ کشمیر کے لیل و نہار

غلط نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ ریاست جموں و کشمیر میں جمہوریت کا جو تجربہ ہو رہا ہے۔ اس کی اساس مضبوط بنیادوں پر قائم کی جا رہی ہے۔ جمہوریت کے اس تجربہ کا ایک اور اہم قدم نئے آئین کے تحت پہلے عام انتخابات کا انجام پذیر ہوتا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کے پہلے جمہوری چناؤ تھے۔ نئے آئین کے تحت ریاست کی مجلس قانون ساز کے لئے ایک سو ممبران مقرر ہوئے ہیں۔ ان میں سے پچیس ممبران کے لئے مخصوص نشستیں بھی ہیں جو جنگ بندی سرحد کے اس پار کے ریاستی عوام کے لئے رکھی گئی ہیں۔ جو اس وقت پاکستان کی غلامی برداشت کر رہے ہیں۔ جنگ بندی سرحد کے اس پار کی ۷۵ نشستوں میں سے اس مرحلہ پر ۱۸ نشستوں کے انتخابات مکمل کر لئے گئے ہیں۔ سات نشستوں کے انتخابات اس لئے روک رکھے گئے ہیں۔ کیونکہ یہ انتخابی حلقے ریاست کے ان دور افتادہ اور دشوار گزار علاقوں میں ہیں۔ جو ابھی تک برف سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ ان سات نشستوں میں سے دو اپریل کے آخر میں ان پہاڑی علاقوں کی برف پگھلنی شروع ہوگی اور مئی میں موسم خوشگوار ہوتے ہی وہاں چناؤ عمل میں لائے جائیں گے۔

بے لاگ مبصر اس بات پر متفق ہیں کہ ریاست میں عام انتخابات عمل میں لانے کا کام پوری دیانت داری اور غیر جانبداری سے ہوا۔ سیاسی پارٹیوں کو انتخابات میں حصہ لینے کی پوری آزادی اور سہولتیں دی گئیں۔ اور ووٹروں میں بھی یہ احساس پیدا کیا گیا۔ کہ ایک جمہوری سٹیٹ میں ووٹ کی قدر و قیمت کیا ہے۔ بلاشبہ جمہوریت وہ ہے جس میں ہر ایک شہری کو رائے دینے کا انسانی حق حاصل ہو۔ اور ہر ایک مکتب خیال کے ووٹر کو اپنی مرضی اور ارادہ ظاہر کرنے کی آزادی ہو۔ غیر ملکی نمائندوں نے بھی نئے آئین کے تحت ریاستی عوام کو پہلی بار اپنے اس حق کا استعمال کرتے ہوئے دیکھا۔ سمندر پار ملکوں کے کئی نمائندے ریاست میں انتخابات کا جائزہ لینے کے لئے مختلف انتخابی حلقوں میں گھومے پھرے اور انہوں نے یہ دیکھ کر اطمینان کا اظہار کیا کہ ووٹر بڑی گرمجوشی اور آزادی کے ساتھ اپنے ووٹ استعمال کر رہے ہیں۔

صوبہ جموں میں ووٹروں نے نہایت ہی خوشگوار موسم میں ۲۵ مارچ کی صبح سے شام چھ بجے تک اپنے ووٹ کا استعمال کیا۔ دور دور دیہات سے نوجوانوں سے لیکر نحیف و نزار بوڑھے تک ووٹ ڈالنے کے لئے پولنگ سٹیشنوں پر آئے۔ جس تعداد میں عورتوں نے اپنے ووٹ کا استعمال کیا وہ حوصلہ افزا تھی۔

صوبہ کشمیر میں ووٹ ڈالنے کا کام ۳۰ مارچ کو ہوا۔ بد قسمتی سے اس دن شدید بارش ہو رہی تھی اور بہت سے ووٹر اپنے ووٹ کا استعمال نہ کر سکے۔ لیکن اس کے باوجود لگ بھگ پچاس فیصدی ووٹروں نے ووٹ کا استعمال کیا۔ جنہوں نے ووٹروں کو بارش کے پانی میں تر بتر ہوتے ہوئے پولنگ سٹیشنوں پر جمع دیکھا وہی ان کی گرمجوشی کا اندازہ لگا سکے ہوں گے۔

انتخابات کے نتائج کا اعلان ہو جانے سے نیشنل کانفرنس نے مجلس قانون ساز کے ایوان میں قطعی اکثریت حاصل کی ہے۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ ریاستی عوام کی اکثریت نے نیشنل کانفرنس پر اپنے بھرپور اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ اور اسی کو ریاست کا انتظام

سنبھالنے کے اہل قرار دیا ہے۔ انتخابات میں دوسری پارٹیوں نے جو پوزیشن حاصل کی ہے وہ یہ ہے:۔

پرجا پریشد ۵ - ہریجن منڈل ۱ - آزاد ایک۔

انتخابات میں جو اُمیدوار پرجا سوشلسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر کھڑا ہوئے تھے، وہ کسی حلقے میں اپنی ضمانت کھو بیٹھے۔ اور کسی حلقے میں ووٹوں کے معمولی فرق سے رہ گئے۔

مجموعی اعتبار سے یہ تمام انتخابات ریاست جموں و کشمیر میں جمہوریت کے تخلیقی ارتقا میں سیاسی سماجی اور تہذیبی زندگی کے ہر شعبہ میں انتھک پیش قدمی اور عوام کے مفادات کے لئے حکومت کی عملی سرگرمیوں کے لئے نئی راہیں ہموار کر چکے ہیں۔ انتخابات کے ان نتائج کا بین الاقوامی حالات پر اثر پڑنا بھی لازمی ہے۔ اس لئے کہ کشمیر بین الاقوامی بحث و مباحثہ کا مرکز اور موضوع بنا ہوا ہے۔ اس موضوع پر جو لوگ یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ کشمیر کی تمام قوتیں امن اور جمہوریت کی خاطر ہندوستان کی دوسری ریاستوں کے ساتھ اشتراک عمل پر ہی بھروسہ رکھتی ہیں۔ ان لوگوں کی پوزیشن ریاست میں عام انتخابات کے نتائج سے اور بھی مضبوط ہو گئی ہے۔

بہرحال حق یہ ہے کہ انتخابات کے نتائج کا ریاست کے اندر اور باہر اگر پُرجوش خیر مقدم ہُوا ہے، تو دوسری طرف ریاست کے دشمنوں میں اس سے خوف اور ہراس بھی پیدا ہوا ہے۔ ان انتخابات میں ریاستی عوام نے ایک بار پھر ریاست کے نئے آئین کی توثیق کر دی ہے اور ان بنیادی اصولوں کے ساتھ اپنے جذباتی میلان کا ثبوت دیا جس کی اساس پر اس آئین کو مرتب کیا گیا ہے۔ اس آئین کو نہ صرف ریاستی عوام کی بلکہ ملک کی دوسری ریاستوں کے عوام کی تائید اور حمایت بھی حاصل ہے۔ اتنا ہی نہیں برطانیہ کی لیبر پارٹی کے ایک ذمہ دار لیڈر مسٹر بیوان نے بھی ریاست کشمیر کے نئے آئین پر پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ آپ اپریل کے پہلے ہفتہ میں تین دن کے دورے پر کشمیر آئے تھے۔

مسٹر بیوان نے کشمیر میں ہر خیال کے لوگوں سے ملاقات کی باغات کی سیر کی۔ قومی توسیعی سروس سکیم کے دائرہ میں لائے گئے دیہات کو دیکھا۔ کارخانوں میں گھومے پھرے۔ عبادت گاہوں کو دیکھا۔ کاریگروں کو اپنے مرکزوں میں کام کرتے ہوئے پایا۔ اور تعمیر نو کے لئے عوام کی گرمجوشی اور لگن دیکھ کر مسرت بخش تاثرات کا اظہار کیا۔ سری نگر کے شہریوں کی طرف سے آپ کے اعزاز میں ایک استقبالیہ تقریب منعقد ہوئی۔ جس میں چیدہ چیدہ شہریوں، سرکاری افسروں، ریاستی وزراء کے علاوہ مرکزی سرکار کے وزیر شری وی، کے، کرشنا مینن بھی شامل ہوئے۔

مسٹر بیوان نے اس تقریب میں کئی اہم باتیں کہیں۔ انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ سمندر پار کے ملکوں میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو کشمیر کے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوئے بھی اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں۔ جو محض اُن کی لاعلمی اور کم مائگی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

یہ کہہ کے مسٹر بیوان نے اصل میں مغربی ممالک کے اُن سیاستدانوں پر چوٹ کی جو محض سنی سنائی باتوں اور فرضی افسانوں پر اپنا رویہ متعین کرتے ہیں۔ اور کشمیر کی صحیح صورت حال کا ذرا بھی علم نہیں رکھتے۔ اس کے ساتھ ہی مسٹر بیوان نے انجمن اقوام متحدہ کی مصلحت اندیشی پر بھی نکتہ چینی کی۔ آپ نے کہا۔ "یوں محسوس ہوتا ہے کہ انجمن اقوام متحدہ غیر شعوری طور پر کشمیر کے مسئلے کو نپٹانے میں مشکلات پیدا کر رہی ہے"۔

فی الواقع اگر انجمن اقوام متحدہ میں سیاسی سودا بازی کے لئے نجی مصلحتوں سے کام نہ لیا جاتا، تو ایسے ضروری حالات پیدا ہو سکتے تھے جن میں اس سوال کو نپٹانا مشکل نہ ہوتا۔ لیکن انجمن کی بعض طاقتوں کو یہ گوارا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لیبر لیڈر مسٹر بیوان نے جھگڑے کی اصل جڑ کو سمجھ کر کشمیر کے معاملے پر اپنی قطعی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کو کشمیر کا معاملہ باہمی گفت و شنید سے حل کرنا چاہیئے۔ اور کسی بھی بیرونی مداخلت کو بیچ میں نہ آنے دینا چاہیئے۔ چہ جائیکہ یہ بیرونی طاقتیں کتنی ہی نیک نیتی سے مداخلت کیوں نہ کر رہی ہوں"۔ گویا مسٹر بیوان نے ریاستی عوام کی اُمنگوں اور خواہشات کی پُوری ترجمانی کی ہے۔ بلاشبہ یہ وہی رائے ہے جو کشمیر کی سیاسی پارٹیوں اور سیاسی لیڈروں کی

رائے ہے اور مرکزی سرکار کی رائے ہے۔ ہندوستان میں جس کا کشمیر ایک حصّہ ہے۔ سب اس بات پر متفق ہیں کہ کشمیر کے معاملے میں کسی بیرونی طاقت کی مداخلت ہرگز برداشت نہیں کی جائے گی۔ اور برطانوی لیبر پارٹی کے لیڈر نے بھی ہمارے جذبات کے ساتھ اپنے جذبات کو ہم آہنگ کر دیا ہے۔

کشمیر میں قومی ترقی کے کاموں کا جائزہ لیکر ملکی اور غیر ملکی شخصیتوں کی طرف سے جن حوصلہ افزا تاثرات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اس سے اُن لوگوں کے جذبات میں زیادہ ہلچل پیدا ہوئی ہے۔ جو جنگ بندی سرحد کے اُس پار پاکستانی مقبوضہ علاقے میں رہ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ بندی سرحد کے اُس پار کے لوگوں کو جب بھی موقع ملتا ہے۔ وہ جان پر کھیل کر سرحد پار کر کے ادھر آجاتے ہیں۔ مارچ کے دوسرے ہفتہ میں پندرہ مہاجروں کا ایک جتھہ جان جوکھم میں ڈال کر ادھر آیا۔ ان مہاجروں کی جسمانی حالت ہی پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے عوام کی زبوں حالی اور فاقہ کشی کی درد آمیز تصویر پیش کرتی ہے۔ مہاجروں کا پاکستانی مقبوضہ کشمیر سے بھاگ کر ادھر آنا کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ لیکن اس سے پہلے ایک خلاف توقع واقعہ ہوا ہے وہ یہ کہ مظفر آباد کے تین سیاسی ورکر جنگ بندی سرحد سے زبردستی ادھر دھکیل دئے گئے ہیں۔ ان میں مظفر آباد کے ہفتہ وار "کشمیر" کا ایڈیٹر خواجہ ثناء اللہ بھی شامل ہے۔ خواجہ ثناء اللہ اور اُن کے ساتھیوں نے اپنے ایک مشترکہ بیان میں مقبوضہ کشمیر کی جو تصویر پیش کی ہے وہ رونگٹھے کھڑا کرنے والی ہے۔ اُنہوں نے کہا ہے نام نہاد آزاد کشمیر کی حکومت کے تمام اعلیٰ عہدے پاکستانی آفیسروں کے پاس ہیں۔ یہ اعلیٰ آفیسر شبیر محمد فنانس سکریٹری۔ فیروز حسین چیف جسٹس اللہ نواز کریم خان انسپکٹر جنرل پولیس۔ مرزا محمد مظفر اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل پولیس۔ ایچ محمد ڈیولپمنٹ کمشنر اے۔ جی۔ صوفی ڈائریکٹر محکمہ اطلاعات اور دوسرے متعدد اصحاب ہیں۔

انہوں نے کہا ہے۔ مقامی لوگوں پر بھروسہ نہیں کیا جاتا ہے اس لئے ان اور دوسرے افسروں کے عملے حتیٰ کہ چپراسیوں کو بھی پاکستان سے ہی درآمد کیا جاتا ہے۔ اور کچھ وقت پہلے کی بات ہے۔ کہ "آزاد گورنمنٹ" کے سکریٹری جنرل نے حکومت پاکستان کو یہ لکھا کہ چونکہ اس علاقہ میں جہاں دشمن لوگ رہتے ہیں سرکاری راز پوشیدہ رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس لئے مقامی سرکاری ملازمین کی جگہ مرکز یا پاکستان کے دوسرے علاقوں کے لوگوں کو متعین کرنا ضروری ہے۔

خواجہ ثناء اللہ نے کہا کہ حکومت پاکستان نے مظفر آباد میں جو اعلیٰ افسر تعینات کئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ نام نہاد "آزاد کشمیر" میں رائج قوانین اور دوسرے قواعد و ضوابط کے پابند نہیں ہیں۔ چونکہ یہ آفیسر "آزاد کشمیر" کی عدالتوں کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں۔ اس لئے وہ کھلے بندوں ہر قسم کی بے ضابطگیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ فی الواقع حکومت کے سکریٹری جنرل اور انسپکٹر جنرل پولیس اس علاقے کے قضا و قدر کے مالک ہیں۔ سرکاری ملازموں کی سنیارٹی وغیرہ کا تعین "آزاد کشمیر" حکومت نہیں۔ بلکہ وزارت امور کشمیر کیا کرتی ہے۔ محکموں کے افسران اعلیٰ کے خلاف اپیلوں اور درخواستوں کی سماعت بھی یہی "مختار کل" وزارت کیا کرتی ہے۔ حکومت کے لئے کوئی ضابطہ کار مقرر نہیں ہے۔ احکام کسی خاص منظوری کے بغیر ہی صادر کئے جاتے ہیں۔ آپ نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا۔ جس سے پاکستانی سیاست اور صحافت کے اخلاق پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ آپ نے کہا قیدیوں کے فرار کے افسانے گھڑ کر اصل میں اُنہیں قتل کیا جاتا ہے۔

خواجہ ثناء اللہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے جب کہ اُنہوں نے پاکستانی مقبوضہ کشمیر کی دُرگت کا حال بیان کیا۔

نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی دعا کر میر
کہ اب جو دیکھوں اُسے میں بہت نہ پیار آئے
(میر)

پروفیسر جی، اے، شیخ

زراعتی ترقی اور پانچسالہ منصوبے

کشمیر بنیادی طور پر ایک زراعتی ریاست ہے اور ریاست میں بسنے والے ۸۰ فیصد سے زائد لوگ کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں۔ اس طور پر پیشہ ہمیشہ ریاست کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اور ریاست کی مجموعی خوش حالی کا بہت کچھ انحصار اس کے زراعت کی نہج اور نوعیت پر ہے۔ ظاہر ہے کہ زراعت کے ڈھانچے کا ہماری جالو معیشت کے ڈھانچے سے بہت ہی قریبی تعلق ہے اور جتنی ہماری زراعت ترقی یافتہ ہوگی۔ اُسی قدر ملک کی ترقی میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔

ہماری ریاست میں غذائی مسئلہ ہمیشہ پریشان کن رہا ہے۔ چنانچہ ریاست کی تاریخ کے اوراق اُلٹنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مطلق العنان بادشاہوں اور راجاؤں کے دور میں اکثر کشمیر میں غذائی حالات نامساعد رہے جس کی وجہ کچھ تو حکمرانوں کی غلط روش اور کچھ تو کشمیر کے موسم کی عام نہج تھی۔ ایسے بادشاہ جن کے عہد میں کشمیر غذائی طور خود کفیل اور مطمئن رہا، کشمیر میں بہت عزت سے یاد کئے جاتے ہیں۔

کشمیریوں نے جب اپنی قومی جد وجہد کا آغاز کر کے ایک درخشاں مستقبل کو سنوارنے کی کاوش شروع کر دی۔ تو ہر وقت غذائی مسئلہ اُن کے سامنے بہت ہی اہم حیثیت کا مالک رہا۔ چنانچہ جد وجہد کے عرصہ کے دوران بھی جب اہلِ وطن کے سامنے غذائی مسئلہ نے نازک صورت اختیار کی تو قومی تحریک کے تحت ایجی ٹیشن اور تحریکیں شروع کی گئیں اور حکومت کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ راشن بندی کے معقول طریقے کو ترویج دے۔ اس کے علاوہ قومی تحریک نے مستقبل کے لئے غذائی مسئلہ کو حل کرنے کی جو راہ سوچی۔ اُس کا اندازہ نیا کشمیر میں مندرج اس اقتباس سے ہوتا ہے۔

"اہلِ ریاست کی غذائی بہتری کو مقدم رکھنا۔ یعنی ملک میں بسنے والے لوگوں کو دو وقت کی روٹی مہیا کرنا۔ ہماری قومی تحریک کے سامنے ایک اہم فریضہ رہا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کی خاطر اس پروگرام میں چند تجاویز بھی رکھی گئی ہیں۔ چنانچہ زرعی منصوبے کا مقصد ضروری اشیاء خوراک اور اناج کے معاملے میں ریاست کو قومی کفالت سے بہرہ مند کرنا ہے۔"

چنانچہ جوں ہی نیشنل کانفرنس برسر اقتدار آئی اور ملک میں پہلی عوامی حکومت قائم ہوئی تو تمام ریاست میں جاگیرشاہی کا خاتمہ کر دیا گیا۔ مگر اتنے بڑے ترقی پسند قدم کے بعد بھی ہماری ریاست زرعی بحران کے طوفان میں ہچکولے کھاتی رہی۔ اور اس کی ذمہ دار سابق وزارت کی وہ ناعاقبت اندیشانہ پالیسی تھی جو چند خاص اغراض کے تحت روا رکھی گئی تھی۔ اس دور میں ایکطرف تو تمام ملک غذائی قلت کے خطرناک عواقب سے دوچار رہا۔ اور دوسری طرف سے کسانوں کے طبقے پر اتنے ظلم ڈھائے گئے جس کی نظیر تمام تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس کی وجہ ظاہر ہے، یہ تھی کہ ملک میں ایسے حالات کو جنم دیا جائے جس سے افراتفری۔ غیر یقینیت اور سراسیمگی انتہا کو پہنچ جائے اور چند لیڈروں کے اغراضِ خصوصی پورے ہو جائیں۔

مایوسی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ۹ اگست ۱۹۵۳ء کی وہ یادگار شام کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی۔ جب ریڈیو کشمیر کے سری نگر سٹیشن سے جناب بخشی غلام محمد نے اپنی پالیسی تقریر میں اعلان کیا تھا۔ "مجوزہ کا ظالمانہ سسٹم ختم کر دیا جائے گا۔ سرینگر کے شہر میں شالی کی قیمت دو روپے فی خروار کم کر دی جائیگی راشن کی مقدار بڑھا دی جائے گی اور گھاٹے کے دیہاتی علاقوں میں راشن مہیا کرنے کے مسئلے کی طرف توجہ دی جائے گی۔"

چنانچہ بخشی حکومت نے اپنے قیام کے دن سے ہی جس مسئلے کو اولین اہمیت دی تھی، وہ غذا کا مسئلہ تھا۔ اور بہت جلد عوام نے محسوس کیا کہ اُنکی

مشکلات کے دن بیت چکے ہیں۔ چنانچہ اب وہ آرام سے دو وقت کی روٹی کھانے لگے اور وہ زخم مندمل ہونے لگے جو کئی سالوں سے اُن کو گھائل کئے ہوئے تھے۔

موجودہ حکومت نے کسان طبقے کی فارغ البالی پر سب سے پہلے توجہ کی تاکہ وہ پوری مستعدی سے زراعت کے پیشے پر اپنی تمام تر توجہ اور مشقت مرکوز کر سکیں۔ چنانچہ اس غرض کے لئے کواپریٹو قرضہ جات کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ اس طریقے سے کسان کو اوائل بہار میں اُس کی مختلف ضروریات کے لئے دس روپیہ فی خروار کے حساب سے قرضہ دیا جاتا ہے تاکہ وہ مہاجن اور وڈ دار کے چنگل میں نہ پھنسے جو مدت سے اُن کی کمائی کا ناجائز استحصال کرتے آئے تھے چنانچہ کسان یہ قرضہ لیتے ہیں اور اس سے اپنی ضروریات پورا کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد خزاں میں غلے کی ادائیگی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیہاتیوں کو بیلوں کے لئے بھی قرضے دئے جاتے ہیں۔ تاکہ وہ اچھے اور توانا بیل خرید سکیں جو اُنکی زمین کو اچھی طرح جوت سکیں۔ اور اس طرح پیداوار میں اضافہ ہو جائے۔

اس کے علاوہ موجودہ حکومت کی زبردست کوششیں اس امر پر مرکوز ہیں کہ ریاست کو غذائی پیداوار کے سلسلے میں خودکفیل بنایا جا سکے۔ اس بات کو مدِ نظر رکھکر دوسرے پانچ سالہ منصوبہ میں اس پہلو کو ترقی دینے کے لئے کافی توجہ دی گئی ہے۔ خوراک کی پیداوار کے لئے مندرجہ ذیل ذرائع کو استعمال کیا جا رہا ہے۔

(۱) ایسے بیجوں کو متعارف کیا جا رہا ہے جو کافی اور بہتر نوعیت کی فصلیں پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

(۲) خوراکی اشیاء کے زیادہ اُگاؤ کے لئے کیمیائی کھاد استعمال کئے جا رہے ہیں۔

(۳) زراعتی طریقوں میں سُدھار

(۴) زراعتی بیماریوں کے خلاف جہاد۔

(۵) بہتر قسم کے ذرائع آبپاشی کا تعارف۔

(۶) نئی اور بنجر زمینوں کو سیراب کرنے کا سلسلہ۔

چنانچہ اس وقت تک ان تمام نکات کے سلسلے میں مناسب اقدامات کئے گئے ہیں۔ اس وقت تک بیج کی بہتر اقسام تقسیم کی گئی ہیں۔ اور ان کے نتیجہ میں پیداوار میں کافی اضافہ ہو رہا ہے۔ کیمیائی کھاد کے سلسلے میں سلفیٹ آف ایمونیا کے ہزاروں من تقسیم کئے گئے ہیں۔ یہ کھاد ریاست کی شالی کے زیادہ اُگاؤ کی مہم میں کافی کارآمد ثابت ہوئی ہے اور اس لئے روز بروز مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ اُس کے نتیجہ میں ریاست کی غذائی پیداوار میں قابلِ رشک اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ زراعتی بیماریوں کے خلاف جہاد کے سلسلہ میں بہت سی دوائیاں استعمال کی جا رہی ہیں۔ جن سے فصلوں کو نقصان پہنچتا ہے، اس ضمن میں ٹڈیوں اور باقی نقصان دہ کیڑے مکوڑوں کو مارنے کا کام بھی کیا جا رہا ہے۔

آبپاشی کے ذرائع کو حیرت انگیز طور پر وسعت دی گئی ہے۔ چنانچہ بہت بڑی نہریں نکالی گئی ہیں۔ جن سے بڑے رقبہ جات سیراب ہو رہے ہیں اور اس طرح سے ملک کو غذائی طور خودکفیل ہونے میں ممد ثابت ہو رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں پدگام پورہ کا لفٹ اری گیشن سنٹر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ سنٹر لاکھوں روپے کی لاگت سے تیار ہوا ہے۔ اور اس کی بدولت واٹر پمپوں کے ذریعے ہزاروں ایکڑ بیکار اراضی کو قابلِ کاشت بنایا گیا۔ اور اس سے اب سینکڑوں من غلہ اور باقی اجناس حاصل کئے جا رہے ہیں۔

دوسرے پانچ سالہ منصوبہ میں زراعتی امور سے متعلق کاموں پر کروڑوں روپے خرچ کئے جا رہے ہیں۔ اس پہلو کو کس قدر اہمیت دی گئی ہے اُس کا اندازہ اس بات سے لگ جاتا ہے کہ جموں کے کنڈی علاقہ میں ساڑھے بارہ کروڑ روپے کی لاگت سے ایک نہر نکالی جائے گی، جس سے ہزاروں ایکڑ زمین سیراب ہو سکے گی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ریاست کی زرعی تاریخ کا ایک اہم سنگِ میل ہوگا۔

دوسرے پنج سالہ منصوبہ کے اختتام پر ہماری ریاست زرعی پہلو میں کافی ترقی یافتہ ہو چکی ہوگی۔ اور ہماری کفالت کی منزلیں نزدیک تر آئیں گی۔

حدیثِ دیگراں

جوہو۔ بمبئی
۹-۳-۵۷

مکرمی شمیم صاحب

یاد آوری کے لئے بیحد مشکور ہوں۔ یہ واقعی سچ ہے کہ مہجور میرے بہت ہی پیارے دوست اور بزرگ تھے۔ میری اُن سے پہلی ملاقات ۱۹۳۴ میں ہوئی تھی۔ میں نے اُن کے کلام کے بارے میں ۱۹۳۸ میں شانتی نکیتن کے سہ ماہی رسالے VISHWA BHARATI QUARTERLY میں مضمون لکھا۔ جس کو ٹیگور نے پڑھا اور بہت متاثر ہوئے چنانچہ مہجور کو پہلی بار کشمیر سے باہر متعارف کرنے کا شرف اس ناچیز بندے کو ہی حاصل ہے۔

افسوس میرے پاس وقت نہیں ہے کہ میں اُن کی عظیم شخصیت کے بارے میں کچھ لکھ سکوں۔ بیحد مصروف ہوں۔ ورنہ لکھنے کیلئے بہت ہے۔ مہجور کے ساتھ جو لمحے میں نے گزارے ہیں وہ واقعی میری زندگی کی ایک بیش قیمت یادگار ہیں۔ میں اُن کے بارے میں بہت کچھ لکھ سکتا ہوں۔ مگر افسوس، مجبور ہوں۔

بطور ایکٹر میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا یہ ہے کہ ایک دن مہجور کی زندگی کو فلما سکوں اور فلم میں خود مہجور کا پارٹ ادا کر سکوں۔ کون کہہ سکتا ہے شاید یہ خواب کبھی پورا ہو ہی جائے

آپ کے رسالے کے لئے اپنی دلی شبھ کامنائیں بھیجتے ہوئے۔

آپ کا داس
بلراج ساہنی

---

۱۴ بینک روڈ
الہ آباد

محترمی

رسالہ تعمیر، مجھے بہت ہونہار رسالہ معلوم ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ترقی کی بہت سی منزلیں طے کرتا ہوا یہ رسالہ آگے بڑھیگا۔

خیر اندیش
فراق گورکھپوری

سینٹ جونس کالج آگرہ
ڈیپارٹمنٹ آف اردو اینڈ پرشین

مکرم بندہ۔ تسلیم

علی گڈھ میں علوی صاحب کے پاس تعمیر کا ایک شمارہ دیکھا بے حد پسند آیا۔ آپ کے حسن ترتیب اور محنت کی داد دیتا ہوں۔

تعمیر کے آئندہ شمارہ کے لئے اپنی تازہ ترین فکر غزل کی شکل میں روانہ کرتا ہوں۔ اُمید ہے کہ مزاجِ گرامی مع الخیر ہو گا۔ والسلام۔

آپ کا
مغیث الدین فریدی

---

۱۶ مارچ ۵۷ء
شونانٹ بھجن

مکرمی! خلوص و نیاز، "تعمیر" کے دو شمارے بابت جنوری و فروری نظر نواز ہوئے۔ شکریہ

پروفیسر شکیل الرحمٰن کا مضمون "روش صدیقی محرابِ غزل کے آئینے میں"

بڑا دل آویز ہو کر رہا ہے۔ بیشک روشن صدیقی کے یہاں خیالات کا اچھوتا ارتقاء، اسلوب کا تیکھا پن، ماحول پر ایک گہری بصیرت، داخلی محسوسات کی رنگا رنگ پختگی اور سوز و گداز کی نکھری ہوئی تاثیر اپنی پوری شدت کے ساتھ ملتی ہے جو شاید اس دلربایانہ نکھار کیساتھ دوسرے شعراء کے یہاں کم مل سکے گی۔ آگے چل کر فاضل مضمون نگار نے ایک بڑی پیاری بات کہی ہے کہ "روشن نے اپنی محنت اور ریاضت سے وہ مقام حاصل کر لیا ہے جہاں سے بلندیوں پر جانے کے راستے نزدیک ہو جاتے ہیں"۔

ماسٹر زندہ کول کی غزل سے اردو ترجمہ کی وساطت سے لطف اندوز ہوا۔ اصولاً یہ ترجمے کشمیری ادب کو دوسرے علاقوں سے متعارف کرانے کے لئے موثر ترین ذرائع ثابت ہوں گے۔ لیکن اس "کفِ گل فروش" کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے گل ہائے رنگا رنگ کی نکہتیں بھی اس چمن شوق کے لئے ضروری ہیں تاکہ عام اہل ذوق کی شامہ نوازی بھی ہو سکے۔ اور "میکدۂ تعمیر" سے بلا نوشانِ سخن کو خمارِ تشنہ لبی کا گلہ نہ رہے۔

بہر کیف یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ "تعمیر" آپ کی محنت اور حسنِ سلیقہ کے سائے میں آگے بڑھ رہا ہے۔

آپ کا

فضا ابن فیضی

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید ؏ دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحائی کرد

السلام علیکم! مبارک، سلامت! شمیم عطر آگین گلشن کشمیر نے دھوم مچا رکھی ہے۔ لالہ و گل سے خیاباں خیاباں تعمیر ہو رہی ہے۔ یہ آپ جیسے عالی حوصلہ نوجوانوں کا کام ہے۔ واقعی ایسی خوبصورتی سے رسالہ کی ترتیب کی ہے اور اس انداز سے سجایا ہے کہ لوگ "آج کل" کو بھول گئے ہیں۔ چاندیں کہیں دبکے پائے جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں یہ بھی نہ رہیں۔ سب اپنا اپنا دامن سمیٹے گزرگاہوں سے نکلتے ہیں۔ میں اپنے دامنِ خیال کو یہاں سے لالہ زارِ کشمیر تک وسعت دے رہا ہوں۔ ذرا فرصت ہوئی آپ کے لئے غزل اور نظم بھیجوں! اس خط کے ذریعہ میں آپکو اور آپ کے سرپرستوں اور مددگاروں سب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

دعاگو

نشور واحدی۔ ناظر باغ۔ کانپور

ادبی دنیا

ڈگی روڈ۔ علی گڑھ

محترم شمیم صاحب! امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

"تعمیر" علی گڑھ میں ایس ایس ہال کومن روم میں برابر آتا ہے۔ میں ہر ماہ اسے ضرور دیکھتا ہوں۔ اب اس کے حسن اور نکھار میں خاص شگفتگی آ گئی ہے۔ اور یہ جان کر مسرت ہوئی کہ یہ سب آپ کا فیضان ہے۔

آپ کا

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی

ادبی دنیا۔ ڈگی روڈ۔ علی گڑھ

اردو ڈیپارٹمنٹ۔ کوآپریٹو کالج

جمشید پور (بہار)

پیارے بھائی شمیم

چند روز ہوئے "تعمیر" موصول ہوا۔ دیکھ کر آپ کے ذوق اور کمال محنت کا قائل ہونا پڑا۔ سرورق کا فن انتہائی جاذب نظر ہے۔

مواد کا انتخاب بھی کافی ستھرا ہے۔ البتہ چھپائی عمدہ نہیں۔ جو چیز مجھے سب سے زیادہ پسند آئی۔ وہ کشمیری ادب کی جانب آپ کی خاطر خواہ توجہ ہے۔ اتنے اچھے پرچہ کی اشاعت پر میری مبارکباد قبول کیجئے۔

آپ کا

منتظر شباب







کے آخری سفر کی کہانی
تصویروں کی زبانی

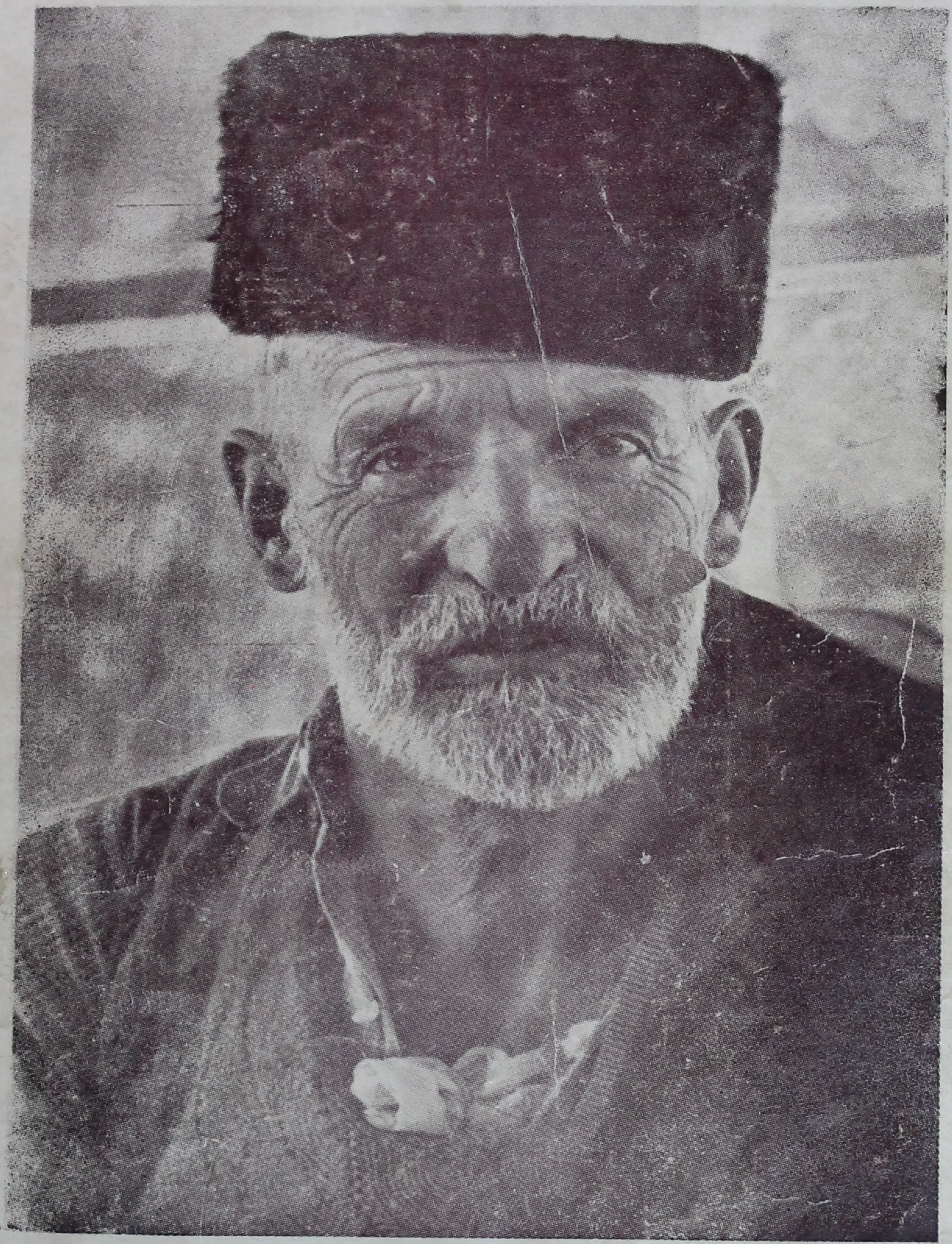


مضمون صفحہ ۵۴ پر ملاحظہ ہو









خرد نے مجھکو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھکو حدیث رندانہ

ایڈیٹر سٹار آف انڈیا علی گڑھ
مولانا آزاد صاحب معروف